لذتِ گفتار
باقر زیدی

روایت کی خشک مزاجی کو حرزِ جاں بنانے والی شاعری اور تجربے کی حدت سے پگھلی ہوئی شاعری میں یہ فرق ہے کہ مقدم الذکر کا سفر اس شکارے کا سفر ہے جو جھیل کی پر سکون سطح پر چپو ارکی ہلکی ہلکی ضربوں کی مدد سے طے ہو رہا ہو' جبکہ موخر الذکر کا سفر اس کشتی کا سفر ہے جو سمندری موجوں کے اتار چڑھاؤ سے ہم آہنگ ہو کر آگے بڑھ رہی ہو۔ روایت سے متاثر شاعری میں لفظی تراکیب ہموار ہو چکی ہوتی ہیں۔ لہٰذا بہاؤ کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتیں۔ دوسری طرف سمندری سفر میں زبان کی تازہ کاری' خیال کی ندرت اور نئے نئے امیجز کی آمیزش سے سفر سیدھی لکیر کا سفر نہیں رہتا۔ قوسوں میں طے ہوتا نظر آتا ہے۔ باقر صاحب کی غزلیں پڑھتے ہوئے پہلا تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ وہ کسی پر سکون جھیل کی شفاف سطح پر رواں ہیں مگر کچھ ہی دیر کے بعد ایک اور تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ ان کے ہاں جھیل کے سفر کو سمندر کے سفر میں تبدیل کرنے کا واضح میلان موجود ہے۔ ہر چند وہ اس بات کے روا نکار میں کوئی قباحت نہیں دیکھتے کہ آج کے زمانے میں میر و سودا کے زمانے کی غزل کا احیاء کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خود انہوں نے نئے زمانے کے اتار چڑھاؤ کو نظر انداز نہیں کیا اور مستعمل لفظی پیکروں کو نبض کی بدلی ہوئی رفتار سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک اہم پیش رفت ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس سمت میں مزید آگے بڑھیں گے اور اپنے شعر میں اسلوب کو بیسویں صدی کے متحرک پیرایۂ اظہار سے پوری طرح ہم آہنگ کر لیں گے۔ ایسا کرنا ان کیلئے قطعاً مشکل اسلئے نہیں کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں اور جانتے ہیں کہ لفظوں کو کیسے استعمال کرنا چاہئے۔

وزیر آغا

لذّتِ گُفتار

ذکر اس کا اگر پیکرِ اشعار میں آوے
کیا کیا نہ مزا لذّتِ گفتار میں آوے

لذّتِ گفتار

باقر زیدی

آلِ شفق پرنٹرز
AAL-E-SHAFAQ PRINTERS

ایل۔ ایس۔ ۶، بلاک ۱۷، فیڈرل بی ایریا کراچی، فون:- ۶۳۴۹۲۶۲

IN THE NAME OF ALLAH, MOST MERCIFUL AND MAGNIFICI NI

AN URDU POETRY BOOK OF NEW ERA

LAZZAT-E-GUFTAR

By

BAQUER ZAIDI

SECOND EDITION
1999

ADDRESS
13600 ENGLEMEN DR,
LAUREL, MD. 20708-1324 (U.S.A.)
Phone No. (301) 498-4988

PUBLISHER
AAL-E-SHAFAQ PRINTERS
LS-6, Block-17, Federal 'B' Area, Karachi, Pakistan.
Phone No: (021) 6349262

ALL RIGHTS ARE SECURED IN THE NAME OF AUTHOR

Price : $ 20.00

انتساب

والدِ گرامی قدر حضرت فرزند حسن زیدی فیض بھرتپوری مرحوم و مغفور

کے نام

جن کی خاموشی سے میری شاعری نے جنم لیا

دانیال، بلال، کساء، رجا، جلا، حرا، جری، فضہ، شجیع اور

ان سب کی نانی اور دادی سلطانہ زیدی عرف چندن

کے نام

جن کی محبتیں ذہنی اِنہماک میں مُخل ہوتی رہتی ہیں

اور

اُن کے نام

جن کا تصوّر تخلیقِ شعر کا سبب بنتا ہے

قطعۂ تاریخِ اشاعت

یہ اربابِ نظم کا فیصلہ ہے
کہا باقرؔ نے جب، اچھا کہا ہے

اَب وجدان کے شاعر یہ بھی شاعر   ہنر یہ سلسلہ در سلسلہ ہے
کہیں ہے غالبؔ و انشاءؔ کی شوخی   کہیں رنگِ قمرؔ اس میں ملا ہے
کہیں گریہ ہے فانیؔ کا کہیں پر   کلامِ میرؔ کا اس میں مزا ہے
کہیں ہے رنگِ عہدِ نو اجاگر   کہیں آئندگاں کا آئینہ ہے
کہے گی لذّتِ گُفتار خود ہی   کلامِ نغز ہے یہ اور کیا ہے
مذاقِ شعر ہے جن کے دلوں میں   ندا ہاتف یہ ان کو دے رہا ہے

بہت دن بد مذاقی میں گزارے
سُنو اب "لذّتِ گُفتار" کیا ہے

——— ۱۹۹۶ء ———

سہبا کاظمی

فہرست

۱	خامشی سے لذّتِ گفتار تک	باقر زیدی ،	۱۱
۲	باقر زیدی۔ خیالات کا بہتا دریا	ڈاکٹر سعادت سعید ،	۱۹
۳	لطیف جذبوں کا شاعر	تابش دہلوی ،	۲۶
۴	خوشگوار لہجے کا شاعر	ڈاکٹر اسلم فرخی ،	۲۹
۵	لذّتِ گفتار کا شاعر	سحر انصاری ،	۳۵
۶	عہدِ حاضر کی شاعری	عابد جعفری ،	۳۹
۷	آج کا شاعر	شہاب کاظمی	۴۰
۸	بالانشینِ مسندِ دربار ہم نہ تھے ،		۴۳
۹	دل پہ کرتے ہیں دماغوں پہ اثر کرتے ہیں ،		۴۵
۱۰	مہ جبینوں کے اعتبار میں ہوں ،		۴۷
۱۱	دیارِ حسن و حصارِ دل و نظر میں رہا ،		۴۹
۱۲	دھوپ کے مستقر میں رہتا ہوں ،		۵۲
۱۳	بوجھ کوئی نہ اپنے دل پر لو ،		۵۵
۱۴	اب وہ اگلے سے ستمگر نہیں آتے دیکھے ،		۵۷
۱۵	تیر کی کوئی ضرورت ہے نہ شمشیر کی ہے ،		۵۹
۱۶	ذکر اس کا اگر پیکرِ اشعار میں آوے ،		۶۱
۱۷	صف میں ہوں جماعت کی زینت فراوانی ہے ،		۶۳
۱۸	وہ گرمیٔ احساس بیانوں میں کہاں تھی ،		۶۵

۱۹ــــ فسکرِ رزقِ حلال کرتے ہیں ،	۶۷
۲۰ــــ ترکشِ حسن میں گر تیرِ جفا اور بھی ہیں ،	۶۹
۲۱ــــ کچھ نہ کچھ شغلہ ہی رہتا ہے ،	۷۰
۲۲ــــ یہ دنیا میکدہ ہے اس کالیوں ہی کام چلتا ہے ،	۷۲
۲۳ــــ ابتدا ہے نہ انتہا ہے کچھ ،	۷۴
۲۴ــــ کبھی کسی پہ نہ ایسا عذابِ جاں گذرے ،	۷۶
۲۵ــــ چمن میں پھول بھی ہوں گے مگر چمن تو رہے ،	۷۸
۲۶ــــ ایک تشویش کھائے جاتی ہے ،	۸۰
۲۷ــــ سب بستیاں ہیں لطف عنایات کے لیے ،	۸۲
۲۸..... جیب و دامن کو تار تار کریں ،	۸۴
۲۹ زمیں بدلے زماں بدلے مکیں بدلے مکاں بدلے ،	۸۵
۳۰ کوئی ہ ا ۔ب جمال ہوا اپنا ،	۸۷
۳۱ تری طلب میں ترے انتظار میں رہنا ،	۸۹
۳۲ــــ کوئی اپنا ہے یہاں اور نہ وہاں اپنا تھا ،	۹۱
۳۳ــــ جو کوئی داستان چھوڑ گئے ،	۹۳
۳۴ــــ وہی تو ایک محبت کا استعارہ تھا ،	۹۵
۳۵ــــ غزل میں جو یہ چاشنی ہے زباں کی ،	۹۷
۳۶ــــ حسنِ افکار میں بھی ہوتا ہے ،	۹۹
۳۷ــــ وہ جا رہا ہے بچھڑ کر مگر خفا تو نہیں ،	۱۰۱
۳۹ اس نسل نے دیکھے تھے جو خواب اور طرح کے ،	۱۰۳
[illegible] [illegible] ہیں ،	۱۰۵

۴۰ ـــ ہمیں تھے اور کوئی اس رہِ عجیب میں نہ تھا ، ۱۰۷

۴۱ ـــ جو ہم سے دور کسی اور ہی گویا ریں ہے ، ۱۰۹

۴۲ ـــ اک بہانہ ہے مسکرانے کا ، ۱۱۱

۴۳ ـــ کوئی امید کوئی التماس رکھتا تھا ، ۱۱۴

۴۴ ـــ جب کبھی یارِ طرحدار کی باتیں لکھنا ، ۱۱۶

۴۵ ـــ وہ اب بھی جانِ تمنا ہے یار ایسا تھا ، ۱۱۸

۴۶ ـــ کچھ دنوں سے اس قدر برہم مزاجِ یار ہے ، ۱۲۰

۴۷ ـــ مکالمے سے ملا قیل و قال سے نکلا ، ۱۲۲

۴۸ ـــ یوسف نہ سہی گرمیٔ بازار رہے ہیں ، ۱۲۴

۴۹ ـــ مسافتوں میں زمانے کی کیا نہیں پایا ، ۱۲۶

۵۰ ـــ فکر میں کچھ بیان ہیں کچھ ہے ، ۱۲۸ ۱۲۸

۵۱ ـــ یوں بھی ہوتی ہے کبھی ردِ عمل کی صورت ، ۱۳۰

۵۲ ـــ بگڑی ہوئی اوقات بنائے نہ بنے ہے ، ۱۳۲

۵۳ ـــ منصف کے فیصلے بھی جہاں دل سے آئے ہیں ، ۱۳۴

۵۴ ـــ اگر یہ ذہنِ رسا اور کچھ رسائی دے ، ۱۳۶

۵۵ ـــ زخمِ دل جب ہرا سا لگتا ہے ، ۱۳۸ ۱۳۸

۵۶ ـــ جس کی خصلت میں ہو دولت کا پجاری ہونا ، ۱۴۰

۵۷ ـــ دکھ سے دامن کیوں بھرتے ہو رہنے دو ، ۱۴۲

۵۸ ـــ جو سرکشیدہ سرِ منصبِ انا ٹھہرے ، ۱۴۳

۵۹ ـــ دونوں سے شکایت ہے مسیحا سے خدا سے ، ۱۴۵

۶۰ ـــ حال اسے لکھنے بیٹھا ہوں سوچتا ہوں کیا حال لکھوں ، ۱۴۶

۶۱ — حسن والے جہاں نہیں ہوتے ،	۱۴۸
۶۲ — وہ نگاہوں میں بسا دل کے مکاں تک آیا ،	۱۵۰
۶۳ — خبر جو رکھتے ہیں آگے کی عہدِ حال سے قبل ،	۱۵۱
۶۴ — وصف یہ عشقِ بوتراب میں ہے ،	۱۵۳
۶۵ — نہ خضر کی نہ کسی راہبر کی بات کرو ،	۱۵۵
۶۶ — خون بہتا ہوا جلتے ہوئے گھر دیکھے ہیں ،	۱۵۷
۶۷ — کشاں کشاں لیے پھرتی ہے جستجو مجھ کو ،	۱۵۹
۶۸ — نجانے کیا ہے کہ جن کو بھلانے لگتے ہیں ،	۱۶۱
۶۹ — کیا بتائیں کہ محبت میں کہاں تک پہنچے ،	۱۶۳
۷۰ — یہی اُمید بہت ہے اک اجنبی کے لیے ،	۱۶۵
۷۱ — عشق ایسی اڑان سے نکلا ،	۱۶۷
۷۲ — رات کی مستی کی تھوڑی منظر آرائی بہت ،	۱۶۹
۷۳ — اب آگے کیا کہوں اتنا بہت ہے ،	۱۷۱
۷۴ — نہ ابر و باد نہ جام شراب مانگتے ہیں ،	۱۷۳
۷۵ — جس کو خود اپنی معرفتِ ذات ہو گئی ،	۱۷۵
۷۶ — سروں کے ساتھ ہوئے تذکرے سنانوں کے ،	۱۷۷
۷۷ مہتابِ نظر دو جہاں نہ کرو ،	۱۷۹
۷۸ سلسلہ ہے کوئی اور نہ رابطہ ہے کوئی ،	۱۸۱
۷۹ [illegible] تھی ،	۱۸۳

خامشی سے لذّتِ گُفتار تک

مقتدرانِ ادب کا خیال ہے کہ صاحبِ کتاب کے حالاتِ زندگی سے واقفیت کتاب کو پڑھنے اور سمجھنے کے کام میں بہت ممد و معاون ہوتی ہے۔ میرے خیال میں یہ بات شعری مجموعوں پر زیادہ صادق آتی ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے ساری زندگی عیش و عشرت میں بسر کی ہو وہ اگر مفلسی۔ بے گھری اور احساسِ محرومی کے موضوعات خواہ کتنی ہی خوبصورتی سے نظم کرے اُن میں وہ اثر پیدا نہیں ہو سکتا جو ایک ایسے شخص کے شعروں میں پیدا ہو سکتا ہے جو واقعتاً ان حالات سے گذرا ہو۔ ریاض خیرآبادی نے شراب کے موضوعات پر بے پناہ لکھا مگر کبھی ایک بوند شراب نہیں پی۔ جگر مرادآبادی نے عمر بھر پی بھی اور شراب کے بارے میں لکھا بھی خوب ہم اگر ان دونوں حضرات کے حالاتِ زندگی سے واقفیت نہ رکھتے ہوں تو ہمارے لیے یہ تمیز کرنا مشکل نہ ہوگا کہ جگر صاحب کے شراب نوشی کے مضامین زیادہ ثقہ اور معتبر

ہیں کہ ریاض خیر آبادی کے۔ کسی بھی کیفیت کو ماہرانہ فنکاری اور صناعی سے خوبصورت اور دل آویز بنا کر پیش تو کیا جا سکتا ہے لیکن ذاتی تجربے کی سچائی زیادہ اثر انگیز ہوتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے آخری ایام کی شاعری جتنی حقیقت انگیز اور تاثر خیز ہے اتنی اس زمانے کی شاعری نہیں جبکہ وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ حالانکہ بہت سے ایسے مضامین ہوں گے جو انھوں نے دونوں زمانوں میں نظم کیے۔ عموماً آدمی کی زندگی مختلف اوقات میں مختلف ادوار سے گذرتی ہے۔ بہار و خزاں ـ مسرت و غم ہجر و وصال۔ وطنیت۔ ہجرت و غربت۔ مشکل اور مساعد حالات وغیرہ اسی لیے آپ کو یہ سارے مختلف رویے ہر شعری مجموعے ہی میں نہیں بلکہ کبھی کبھی ایک ہی غزل کے اندر مل جائیں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے غم ہائے روزگار سے بہت سے لوگ آشنا نہ ہوں۔ مگر حسن و عشق فطرتِ انسانی کی وہ مُسلّم اور آفاقی حقیقتیں ہیں جن سے برائت کا دعویٰ شاید ہی کوئی کر سکے۔ اِس لیے آغازِ شاعری سے آج تک اور آج سے اس وقت تک جب تک شاعری کا وجود رہے گا یہ مضامین انداز اور پیرائے بدل بدل کر فرسودگی کی تہمتوں کے ساتھ ہی یہی نہ صرف نظم کیے جاتے رہیں گے بلکہ قبول عام کے دفتر میں بھی رقم ہوتے رہیں گے۔ آپ کو لذّتِ گفتار میں بھی یہ سارے رویے جھلکتے نظر آئیں گے۔ یہی میری زندگی کے حوالے ہیں یہی تجربات ہیں اور یہی مشاہدات۔

لذّتِ گفتار میرے اُس ادبی سفر پر محیط ہے جو فروری ۱۹۸۷ء میں ملک کے نامور خطیب اور معروف عالم دین جناب علامہ طالب جوہری کی ترغیب سے اُس دوران شروع ہوا جبکہ میں نیشنل بنک آف پاکستان کوئٹہ میں وائس پریذیڈنٹ انسپکشن اینڈ کریڈٹ کی

حیثیت سے فرائض انجام دے رہا تھا۔ لذّتِ گفتار میں ۱۹۸۷ء کی کچھ ابتدائی غزلیں بھی شامل ہیں جو میری مشقِ سخن کی غماز ہیں۔ اِن سے صرفِ نظر اس لیے نہیں کیا گیا کہ قارئین کو میرے شعری سفر کے ارتقائی ادوار کا بھی اندازہ ہو سکے۔

۲۶ر ستمبر ۱۹۳۶ء صُبحِ صادق کے وقت میں نے ریاست بھرت پور کے ایک معزز سیّد گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں ہر وقت شعر و ادب کا چرچا تھا۔ میرے دادا سید اکرام حسین کلیم بھرتپوری ایک معروف شاعر تھے۔ محلہ بُدھ کی ہاٹ کی حویلی جو مہاراجہ بھرتپور مہاراج بلونت سنگھ نے ہمارے جدّ اعلیٰ حکیم محمد علی کو گراں قدر خدمات کے صلے میں دی تھی۔ ہمارا گھر تھا۔ اس وسیع و عریض حویلی میں بہت اُونچے اُونچے محرابی دروازے تھے جن میں سے ہاتھی معہ سوار کے آجا سکتے تھے۔ میں نے بذات خود تو ہاتھیوں کو آتے جاتے نہیں دیکھا لیکن اپنے بزرگوں سے قصے ضرور سنے۔ ننھیال اور ددھیال میں شاعروں کی کمی نہ تھی۔ بعض خواتین بھی شعر کہتی تھیں جن کی شاعری رسم و رواج کے تحت زیادہ تر مذہب تک محدود تھی۔ جناب نیّر اکبر آبادی۔ حضرت بزم آفندی اور علامہ نجم آفندی جیسے شعرا خاندان میں موجود تھے۔ شعر گوئی کا ہُنر ہمیں بھی گھٹی میں ملا۔ شعر کہنا کسی نے سکھایا نہیں اس لیے کوئی استاد بھی نہیں بنایا۔ ہجرتوں فکرِ تکمیلِ تعلیم اور معاشی ضروریات کے پیشِ نظر ایک بہت بڑی مدت یعنی نصف صدی تک یہ ذوق شعر گوئی معرضِ التوا میں رہا شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ والدِ گرامی قدر جناب فیض بھرتپوری مرحوم نے اس خاندانی ورثہ کی نگہداشت کا کام اپنے ذمہ خوش اسلوبی

سے لیا ہوا تھا اور ہم اپنی راہ جو از اس میدان میں نہ پاتے ہوں لیکن جب مرحوم کی قوت گویائی فالج کی نذر ہو گئی تو ہمارے اندر موجود شاعر نے میدان عمل میں آکر اس خاندانی ورثہ کی ذمہ داری سنبھالنے کی حامی بھر لی۔ غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ مرثیے بھی کہے۔ اپنے پہلے مرثیے کے مطلع میں جو ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر سید یاور عباس مرحوم کے بنا کردہ نو تصنیف مراثی کے سلسلۂ مجالس میں اپنے والد کی جگہ پیش کیا اسی طرف اشارہ ہے۔

سر بسر اپنے بزرگوں کا چلن رکھتا ہوں
مدحتِ آلِ پیمبر کی لگن رکھتا ہوں
اک مہکتا ہوا سرسبز چمن رکھتا ہوں
پھول برساتا رہے ایسا ذہن رکھتا ہوں

اور اک لعل و جواہر کی دکاں کھلتی ہے
اک زباں بند ہوئی ایک زباں کھلتی ہے

میری اتنی طویل خاموشی کے دنوں میں ادبی ذوق تسکین ادبی جرائد اور شعراء کے دیوان پڑھنے کے علاوہ مشاعروں میں شرکت سے ہوتی تھی۔ ذمہ داریوں نے سولہ سال ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۷ء تک کراچی سے باہر بدین۔ ٹنڈو آدم۔ حیدرآباد اور کوئٹہ میں رکھا۔ ۱۹۷۵ء میں حیدرآباد میں تھا۔ اسی زمانہ میں حضرت علامہ نجم آفندی کا کراچی میں انتقال ہوا۔ ان کی وفات حسرت آیات پر نجم کے نام سے ایک یادگاری مجلہ شائع کیا۔ ایک مجلہ بیاد فیض بھرتپوری والد کے انتقال پر ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔

یہ سچ ہے کہ مجھ میں موجود شاعر کو باہر نکالنے کا افسوں جناب علامہ طالب جوہری صاحب نے پھونکا مگر خوش قسمتی سے باہر اس کو پذیرائی اور ہمت افزائی کی دھونی دینے کے لیے سرفراز ابد۔ اقبال کاظمی۔ نیّر اسعدی۔ قمر حسنین۔ وحید الحسن ہاشمی۔ شاداں دہلوی اور مرحوم ڈاکٹر سید نعیم تقوی جیسے خوش فکر خوش مذاق اور مخلص بزرگ عزیز اور دوست موجود تھے۔ انھوں نے نہ صرف شعری تحریک کو پے بہ پے ابھارا بلکہ ہمہ وقت اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا۔ ان حضرات کی ان نوازشات کی مہمیز کے بغیر میرے لیے یہ سفر برقرار رکھنا آسان نہ ہوتا۔

والد گرامی کی وفات۔ کراچی کے غیر اطمینان بخش حالات اور تقریباً تمام ننھیالی اعزا کے امریکہ جا کر بس جانے نے میرے اور میرے بچوں پر بھی دباؤ ڈالا چنانچہ سنہ ۱۹۹۰ء میں بیالیس سال بعد کراچی سے میری لیسنڈ امریکہ کی طرف دوسری ہجرت کی۔

نہ جانے میرا مقدر رہیں ہجرتیں کتنی
میں چار دن بھی سکوں سے نہ ایک گھر میں رہا

نئے ماحول میں (NOSTALGIA) کا رنگ اور ابھرا۔ اپنی تہذیبی روایات سے اپنے بچوں کو روشناس کراتے رہنے کی ضرورت کا احساس مزید سے مزید تر ہو گیا۔ اور اس سبب سے یہاں کے سرد ترین ماحول میں بھی اپنے آپ کو ادبی طور پر سرگرم رکھا۔ دوستوں کی پذیرائی نے آتشِ شوق کو ہوا دی اور آج بحمد اللہ لذتِ گفتار آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔

بزرگوں اور اہلِ کمال کا احترام مجھے ورثہ میں ملا ہے اور میں اس کا بہت

خیال رکھتا ہوں۔ شاید اسی لیے میری غزلوں میں پاسِ روایت کی عملی جہد موجود ہے۔ تراکیب، تلمیحات، استعارے، کنائے، محاورے اور روزمرہ میں ادبی روایات کو برقرار رکھنے کی سعی اور نئے مضامین کو روایتی انداز میں اور روایتی مضامین کو نئے انداز میں کہنے کی پوری کوشش کی ہے۔ بحرِ سخن ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے کون ہے جو اس سفر پر چلا اور غوطہ نہیں کھایا۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھا کہ کسی غلطی پر یہ سینہ زوری نہیں کی" کہ میں اسے جائز سمجھتا ہوں"۔ جدت کے نام پر ادبی بے راہ روی کو راہ فرار بھی سمجھتا ہوں اور بے بضاعتی بھی۔

لذتِ گُفتار میں گفتار تو بہت ہے لذّت بھی ہے کہ نہیں یہ فیصلہ میں قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں اس استحسان کی توقع کے ساتھ کہ وہ میری لغزشوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی میں کسی بخل سے کام نہیں لیں گے۔ ایک اور بات جو کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ بیشتر غزلیں کیونکہ امریکہ میں کہی گئی ہیں اس لیے بعض مقامات پر ظاہری اور باطنی نسبتوں کی بہتر تفہیم کے لیے ضروری تھا کہ انھیں یہاں کے سیاسی سماجی معاشی اور معاشرتی تناظر (PERSPECTIVE) میں دیکھا جائے۔

سپاس و تشکر

جہاں میری شاعری کی ترویج و ترقی میں بہت سے دوستوں کا تعاون شامل ہے وہاں لذّتِ گُفتار کی اشاعت میں بھی بہت سے عزیزوں اور دوستوں

کی کرم فرمائیاں شاملِ حال ہیں ان میں جو حضرات خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں اُن میں برادرم شکیل آزاد کا نام سرِفہرست ہے کہ اُنھوں نے نہ صرف کتاب کی اشاعت پر بطورِ خاص مائل کیا بلکہ اس کی طباعت وغیرہ کے انتظامات کی ذمہ داری بھی لی۔ برادرم شہاب کاظمی نے نہ صرف مسودے کی تہذیب میں گرانقدر مشورے دیئے بلکہ اپنی نگارشات سے بھی سرفراز کیا۔ جناب جعفر رضوی اگر تعاون خصوصی نہ فرماتے تو یہ کتاب بے تصویر رہ جاتی۔

پاکستان کراچی سے جناب ڈاکٹر اسلم فرخی، حضرت تابش دہلوی اور پروفیسر سحر انصاری لاہور سے جناب ڈاکٹر وزیر آغا اور جناب ڈاکٹر سعادت سعید اور کینیڈا ٹورنٹو سے جناب اشفاق حسین اور جناب عابد جعفری کا بڑے صمیمِ قلب سے سپاس دار ہوں کہ اپنی شدید مصروفیات کے باوجود اپنی نگارشات روانہ فرمائیں جو "لذّتِ گفتار" کے اعتبار میں اضافہ کا سبب ہیں۔

برادرم ڈاکٹر تقی عابدی۔ عزیز و محترم جناب اختر عباس نقوی صاحب اور میرے برادرانِ خورد جعفر زیدی، نسیم فروغ اور مسعود زیدی کی مسلسل ترغیب، ہمت افزائی اور ذہنی اور معنوی اشتراک بھی خصوصی تشکر کے مستحق ہیں۔

اور

سب سے آخر میں بہت زیادہ شکریہ کی مستحق میری بیوی ہیں جنھوں نے اپنی

جیبِ خاص سے اِس کتاب کی اشاعت کے مصارف کا بار اُٹھانے کا وعدہ کیا۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

والسلام
سید باقر حسن زیدی

امریکہ کا پتہ :

BAQVER ZAIDI
13600 ENGLEMAN DR.
LAUREL MD 20708-1324
VSA
TELE NO (301) 4988

باقر زیدی: خیالات کا بہتا دریا

یہ کہنا کہ بیسویں صدی میں اُردو غزل نئی وسعتوں سے ہمکنار ہوئی ہے اب کوئی اچنبھے کی خبر نہیں ہے۔ کیسے کیسے اہل ہنر شاعروں نے اسے دوامی اعتبار بخشا ہے۔ اصغر، فانی، یگانہ، حسرت، اقبال، فراق، فیض، امجد، ندیم، شکیب، جالب، ناصر، منیر، ظفر، فراز، ساجد، شاکر، عارف اور بہت سے دوسرے..... غیب سے کیسے کیسے پیغام آئے اور قلمبند ہوئے..... صریر خامہ نوائے سروش ہے۔ خیالات کے پھیلاؤ کا بہاؤ، فکر کے اعماق! اس صدی نے ہمیں احساس کی دولت دی ہے۔ یہ شاعری مبالغے اور جھوٹ سے سروکار نہیں رکھتی تجربے کی پیداوار ہے۔ آج کا میر فی الحقیقت گھڑی بھر میں ہزار بار مرا ہے..... اس کے پاس زندگی کرنے اور ہنر آزمانے کے موقعے ہی موقعے تھے۔ خواص پسند گلزار معرفت سے لے کر عوام پسند باغ حقیقت تک خیالات کے کیسے کیسے تیور تھے جو دیکھنے اور برتنے کو ملے۔ ہمارے شاعر ہمارے گلاب کے پھول بھمبروں کے سے مسکراتے چہرے لیے سلگتے رہے سلگاتے رہے۔ روایت سے جدت تک اور تہذیب گرفتگی سے ترقی پسندی تک کیا کچھ تھا کہ جو معرض اظہار میں نہ آیا لیکن

ہل من مزید۔۔۔۔۔ کون ایسا تھا جو حریف مئے مردافگن عشق نہ ہوا۔۔۔۔ یہ سوز نہاں کا آتشکدہ اظہار میں آیا۔۔۔۔

آج کا شاعر اپنے افکار کی دخانی کشتیوں سمیت بحر شاعری کی سیر کر رہا ہے۔ یہ وہ طوطی ہے جسے شش جہت میں آئینے ہی آئینے نظر آ رہے ہیں! نئی اخلاقیات کے عکس، جذبات کی جھلملاتی کہکشائیں، فکر کی پرچھائیاں، رومان کی نئی لہروں میں بھی چاشنی ہے، اوباشی کے خیالات ہُنر مندی کے نگھار میں مستور ہیں۔ یہ اہل دل کا عزم سفر ہی تو ہے کہ پتھریلی دیواروں میں در بن رہے ہیں۔ بایں ہمہ باقر زیدی نے پرانے ہنرمندوں کی خدمت میں مودبانہ سلام پیش کرتے ہوئے نئے زمانے کے چبوترے پر قیام کیا ہے۔ انھوں نے ایک تخلیقی مفکر کی طرح گرد و پیش کے منظروں پر نظر ڈالی ہے۔

ہُنر کا حسن تھا جام سفال میں بھی مگر
کمالِ کوزہ گری دست کوزہ گر میں رہا

عزت کی زندگی کی تو خواہش ضرور کی
لیکن حریصِ منصب و دستار ہم نہ تھے

راستی کے رستے پر کیوں قدم نہیں اٹھتے
بھیڑ بھی نہیں ہوتی راہ بھی کشادہ ہے

چلو چلو کہ کسی کے تو کام آجائیں
سنو سنو کہ صدا ہم کو دے رہا ہے کوئی

باقرؔ زیدی نئے عہد میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے نئے خواب دیکھ رہے ہیں۔ نقالی اور تقلید کی روش پر خطِ تنسیخ کھینچنے کے درپے ہیں۔ ان کے جذبے بھی اپنے ہیں اور خیالات کی ترتیب بھی اپنی۔ روایات کے دھارے ان کے خیالات کے سمندر میں مل کر نئی لہروں کو فروغ بخش رہے ہیں۔ انھوں نے جنبشِ کلک سے صدیوں کا سفر طے کرنے کا جو دعویٰ کیا ہے بے سود نہیں ہے۔

آشفتہ سروں کے لیے گھر کب تھے مناسب
صحرا میں جو وسعت تھی مکانوں میں کہاں تھی

جب زوال آفتاب کا دیکھا
سایہ بھی سائبان سے نکلا

آج ممکن نہیں مطلب کے خداؤں کا شمار
صرف بت ہی نہیں لوگوں کے خدا اور بھی ہیں

میں دیکھ لیتا ہوں بینائیوں سے آگے بھی
سنائی دیتی ہے خاموش گفتگو مجھ کو

صرف چہرے بدلتے رہتے ہیں
آئینہ آئینہ ہی رہتا ہے

باقرؔ نے "میں" یا اس کے مترادف "ہم" کو سلیقے سے برتا ہے۔ واحد متکلم کی گونج ہے کہ نت نئی صوتی شبیہوں کو ابھار رہی ہے۔ دعوے کی شاعری تہذیب

انکسار کا دامن کبھی چھوڑنے نہیں دیتی۔

ہماری بات نہ پوچھو عجیب لوگ ہیں، ہم
کہ شاخِ خشک پہ تازہ گلاب مانگتے ہیں

ہمارا دل ہے آئینہ کی صورت
جو چپ رہتا ہے اور کہتا بہت ہے

ہم تو سبزہ بچا کے چلتے ہیں
لوگ دل پائمال کرتے ہیں

باقر زیدی کی شاعری میں اپنی جڑوں اور اپنی زمین سے الگ ہوجانے کے معاملات مرکزی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے ڈس پلیس منٹ اور ایلیانیشن کے تصورات کو اپنے حواس کے وسیلے سے گرفت میں لیا ہے۔ ارادی اور غیر ارادی ہجرتوں نے ان کے شعور و فکر کو نئے رنگ عطا کیے ہیں۔ اجنبی ماحول انھیں میدان کارزار معلوم ہوا ہے۔ شاعری کے سمندر کی انتہا نہیں ہے۔ شاعر کی کئی ہجرتیں اس کی پلیٹ میں آگئی ہیں۔ بے دیاری کے ساتھ ساتھ نئے ماحول کی بے چہرگی، یکسانیت اور روٹین نے بھی انھیں بہت متاثر کیا ہے۔ ان کی غزلیں ان کی ہجرتوں سے پیدا ہونے والے تاثرات کا منہ بولتا ثبوت ہیں...... طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ ! بے زمینی کا خلفشار ! اچھا ہوا شاعر سلگا تو بہت ہے لیکن اپنے معاصر نغز گوؤں سے مختلف ہوگیا ہے۔

اپنی مٹی بھی گئی اپنا تشخص بھی گیا
کوئی تو ہو جو اس احساس زیاں تک پہنچے

سبھی کو راس کہاں تھا زمین سے رشتہ
وطن میں رہ کے بھی کچھ لوگ بے وطن تو رہے

ہم جو ہوتے وطن میں تو شاید
اس طرح رائگاں نہیں ہوتے

کیا یہ بستی اجڑنے والی ہے
لوگ اپنے مکان چھوڑ گئے

باقر زیدی کی غزلوں میں دیارِ حسن، گل عشق، کیفیت وجود، عہد خونی کا حملہ، موت کی بے رحمی، سجدۂ عقیدت، دستِ کوزہ گر کا امکان، اپنا گھر، اپنی اپنائیت، نئے وصال کی آرزو، دعاؤں کی بے اثری اور ہجرتوں کا بھاری سایہ سب کچھ علیحدہ علیحدہ بھی ہے اور گڈ مڈ بھی ہو گیا ہے۔ ان کے خیالوں اور جذبوں کے قطروں نے مل کر ہی ان کے "شعر سمندر" کی تخلیق کی ہے۔

باقر زیدی کی غزلیں تزئین خیال اور حسن بیان کے امتزاج کا نتیجہ ہیں۔ انھیں قرطاس و قلم پر بٹھائی جانے والی قدغن پسند نہیں آتی۔ وہ اس رویے کے خلاف علم احتجاج بلند کرتے ہیں اور زنجیر کی صدا میں نغمہ حریت کا ادراک کرتے ہیں۔ انھیں غالب کی طرح زنجیروں کے حلقے موئے آتش دیدہ نظر آتے ہیں۔ تزئین خیال و حسن بیان

میں وہ غالب سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ میر کے صوت و آہنگ سے ان کی شناسائی اس امر کی غماز ہے کہ انسانی دکھوں اور غموں کے تجزیے بھی ان کے دیکھے بھالے ہیں۔ دکھ اور سکھ کی انتہاؤں پر پہنچ کر صوت و معانی کی دنیا میں حدِ اعتدال سے سبکدوشی معمول کی بات ہے۔ شعری رعایات سے استفادہ نہ کرنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے۔

باقر زیدی کا مسلک واضح اور جادہ ہموار ہے۔ ان کا عزم ناحقوں کی بستی میں حق یابی کے لیے کوشاں ہے۔ شعر کو انھوں نے بھولے بسرے لمحوں کی بازگشت کا وسیلہ بھی بنایا ہے اور اس کے ذریعے انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بھی ملاحظہ کیا ہے۔ مختلف النوع دعوؤں کے ساتھ ساتھ باقر زیدی شاعری کو انسانی نفسیات کی تفہیم اور فطری جذبات کی "تطہیر" کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ شاعری ان کے لیے تجربے اور یاد سے وابستہ کیفیات کی بازگشت کا نام نہیں ہے اور نہ ہی انھوں نے اسلوبی اور بیانی تزئین کو کافی سمجھتے ہوئے شہرِ زبان کی آئینہ بندی کی ہے۔ وہ معاصر انسانی تجربے کو یاد کے چراغوں سے یوں منور کرتے ہیں کہ ان کا خیال اپنی تہہ داریوں کے باوجود قاری تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ زبان کی تراش خراش اور تزئین و آرائش کے عمل سے گزرتے ہیں۔ وہ مستند و اہم شعرا کے طرزِ عمل کے مانند شاعری کو آفاقیت کے لیے وقف کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ شاعری کو صرف مخصوص افراد کا نہیں نوعِ انسانی کا مطالعہ جانتے ہیں۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ وہ عام انسانی مظاہر کے خواص اور اشتراکی قدروں کو مرکزِ اظہار بنائیں۔

جنھیں راس آ ہی گئی بے لباسی
انھیں کیا ضرورت لباسِ کتاں کی

صرف چہرے بُرے نہیں ہوتے
عیب کردار میں بھی ہوتا ہے

تن کے اجلے من کے میلے پنڈت، ملا، پوپ، گرد
مندر، مسجد اور کلیسا، جگ ہے سارا جال لکھوں

دانش نے دکھائے ہیں سراب اور طرح کے
برسیں گے زمینوں پہ سحاب اور طرح کے

ہمارے زمانے میں شاعری کے اخلاقی اور افادی پہلوؤں پر بہت سے نقادوں نے قلم اٹھایا ہے اور نظریہ سازی کرتے ہوئے شاعر کے عملِ تخلیق کی نوعیت، شاعری اور اخلاقیات اور شاعر اور نجی یا گروہی تاریخ کے مسائل پر سیر حاصل مباحث رقم کیے ہیں۔ باقر زیدی کی غزلوں کا مطالعہ اس امر کا شاہد ہے کہ شاعر اخلاق کے مختلف زاویوں کو فنکارانہ انداز سے یوں پیش کر سکتا ہے کہ اس پر مصلحِ اخلاق ہونے کا الزام نہیں لگ سکتا۔ ناانصافی، طبقاتیت، غربت، ناداری، اختیار، حکمرانی، پسماندگی، ایمان اور عقیدت کے معاملات و مسائل کے تناظر میں شاعر کو کس قسم کے اخلاقی رجحانات کا علمبردار ہونا چاہیے باقر زیدی کی غزلیں ان کی نقیب ہیں۔ ان کا مزاج معتدل، اور متوازن ہے۔ انھوں نے عہدِ نو میں دریافت ہونے والے جذبات و احساسات کے نئے منطقوں کو اپنی روایات اور تہذیب کی روشنی ہی میں پذیرائی بخشی ہے اور ایک کلاسیکی شعری سانچے کا سہارا لے کر اس امر کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ یہ سانچہ آج کے شعری اظہار کے لیے بھی کارآمد اور سودمند ہے۔ باقر زیدی نے غزل کے بندھے ٹکے فنی اصولوں سے انحراف نہیں کیا اور اپنے خیالات میں ہونے والی شکست و ریخت کو ہیئت کی تبدیلی کے لیے جواز نہیں بنایا۔ اس پس منظر میں قاری اپنے مطالعے سے جان لے گا کہ عجزِ بیان اور قادرالکلامی میں کیا فرق ہے؟

ڈاکٹر سعادت سعید

لطیف جذبوں کا شاعر

انسان اس بھری پُری دُنیا میں بالکل اکیلا ہے بالکل آدم کی طرح اور وہ آدم ہی کی طرح خود ساری زندگی کی تہذیب و تدوین کرتا ہے اور ہر آدمی اسی عمل کو دُہراتا ہے لیکن زندگی کی تہذیب و تدوین میں اُس نے اپنے تمام جذبوں کو زبان دے دی ہے یہ جذبے جلسی، تہذیبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور مذہبی ہیں اور ان جذبوں کے لبِ اظہار کے لیے اس کے سینکڑوں کردار ہیں اور ان کرداروں کے ذریعے جو جذبے اظہار پاتے ہیں وہ بہیمانہ بھی ہیں اور لطیف بھی انہی لطیف جذبوں میں شاعری بھی ہے۔

شاعری کیا ہے اس سوال کا جواب بھی ہے شاعری، جو سوز و گداز کے ساتھ پاکیزہ جذبات کے اظہار کا نام ہے، شاعری کا وظیفہ ہمیں مسرت سے دوچار کرتا ہے، شاعری کا مقصد انتشارِ خیال نہیں، اس کا مقصد خوف و دہشت کی عکاسی یا تشبیہوں اور استعاروں کا کابوس نہیں اور نہ لسانی طور پر ناممکن اظہارات کی بے ہنگم نمود و نمائش ہے، شاعری تو ہوشمندی کی بازیافت ہے، شاعری نری فلسفہ و حکمت بھی نہیں اور شاعری تمام پند و نصیحت بھی نہیں۔

مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں اگر ہم باقر زیدی کے مجموعۂ کلام "لذّتِ گفتار"، کا

جائزہ لیں تو ہمیں یہ تمام جذبے یہ سارے خیالات ان کی شاعری میں بدرجہ اولیٰ نظر آئیں گے۔ باقر زیدی ایک ادبی علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کی ننھیال ودھیال میں بعض مقتدر ادیب اور شعراء گذرے ہیں خود ان کے والد بزرگوار فیض بھرتپوری قادرالکلام شاعر تھے اور رثائی ادب خاص طور پر ان کی شناخت ہے، اسی لیے باقر زیدی کو اپنی شعری صلاحیتوں کی پرداخت میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی انھیں صرف ایک مہمیز کی ضرورت تھی جو علّامہ طالب جوہری نے فراہم کردی۔

باقر زیدی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا سراغ لگانا زیادہ مشکل نہیں وہ اپنی شعری صلاحیتوں کا اظہار غمِ جاں اور غمِ جاناں کے وسیلوں کے علاوہ حیات اور ماورائے حیات کے مسائل کے ذریعے بھی کرتے ہیں اور اس اظہار کے لیے ان کے استعارے اور تشبیہیں نہایت دلکش اور سادہ ہوتی ہیں، ثقیل الفاظ ان کی لفظیات کی فہرست میں نہیں، مضامین کا نیاپن ان کے اسلوب شعری کو زیادہ حسین بناتا ہے، پُرانے مضامین کو بھی وہ نیا پیکر دیتے ہیں اور اس طرح شاعری کے جاں سوز تاثر کو مجروح نہیں ہونے دیتے، وہ بیسویں صدی کے آدمی ہیں بیسویں صدی کہ جس میں خرابے زیادہ آباد ہوئے ہیں اسی لیے ان کے لہجے کا درد ان کے جذبات کی عکاسی میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ باقر زیدی بھی زندگی کے مسائل دوسروں کی طرح بیان کرتے ہیں مگر وہ اپنے لبِ اظہار میں دوسروں کی نقالی نہیں کرتے بلکہ اپنا لہجہ سامع اور قاری کی ذہنی سطح کے مطابق رکھتے ہیں اور یہی انفرادیت ہے جو بہت کم شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔

آئیے باقر زیدی کے کچھ شعر پڑھیں ؎

جنبشِ کلک سے صدیوں کا سفر کرتے ہیں
وقت کی تیز خرامی ہمیں کیا روکے گی

ہم نشیں خوب ہے یہ محفلِ یاراں کہ یہاں
وہ سلیقہ ہے کہ عیبوں کو ہُنر کرتے ہیں

ہُنر کا حُسن تھا جامِ سفال میں بھی مگر
کمالِ کوزہ گری دستِ کوزہ گر میں رہا

نسلِ آئندہ فصل ہے میری
میں پدر ہوں پسر میں رہتا ہوں

کچھ تو ہم سے بھی خدا کو ہے توقع شاید
ہم جو آئے تو پیمبر نہیں آتے دیکھے

کل یہی پابسلاسل ہی قفس توڑیں گے
نغمۂ حریت آواز میں زنجیر کی ہے

بیٹیاں ہاریوں کے گھر نہ رہیں
جب وڈیرے لگان چھوڑ گئے

کسی کے حسن پہ ایسا کبھی اجارہ تھا
ہمارا کچھ بھی نہ تھا اور سب ہمارا تھا

ہر قریۂ بے مہر میں بانٹی ہے محبت
ہم اپنے فرائض سے خبردار رہے ہیں

عجیب تھی وہ محبت کی زندگی باقرؔ
طلب بھی کچھ نہ کیا اور کیا نہیں پایا

اِن شعروں میں آپ کو وہ تمام جذبات ملیں گے جو انسانی رویوں سے پیدا ہوتے ہیں اور جو شعر کی صورت میں ڈھل کر کبھی آپ بیتی اور کبھی جگ بیتی کا نام پاتے ہیں اور اس طرح ایک تہذیب مرتب ہوتی چلی جاتی ہے۔ یقین ہے کہ باقرؔ زیدی کا یہ مجموعہ جدید حسیت کی غزل میں ایک خوشگوار اضافہ ثابت ہوگا۔

تابشؔ دہلوی

خوشگوار لہجے کا شاعر

باقر زیدی صاحب بڑے خوش نصیب شاعر ہیں ۔ خوش نصیب یوں کہ اس خاکسار نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی سُنا اور دیکھا ہے کہ شاعروں کی بیویاں اُن کے کمالِ سخن کے باوجود اُن سے ناراض ہی رہتی ہیں ۔ حد یہ ہے کہ اُمراؤ بیگم نے اپنے اور مرزا غالب کے کھانے پینے کے برتن بھی الگ کر لیے تھے ۔ آج کل برتن تو الگ نہیں ہوتے مگر برتنوں میں کھڑ کھڑاہٹ حسبِ دستور ہوتی رہتی ہے اور شاعروں کی بیویاں اپنے شاعر شوہروں سے نالاں ہی نظر آتی ہیں ۔ زیدی صاحب کی خوش نصیبی یہ کہ اُن کے اس مجموعۂ کلام کی اشاعت کے سارے اخراجات ان کی بیگم نے اپنی جیب خاص سے ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے ۔ میری رائے میں اُردو شاعری کی تاریخ میں "یہ بیوی پسند سخن و سخنور" کی اولین تابندہ مثال ہے اور اس سے باقر زیدی صاحب کے "باہمیں مَردُمان بباید ساخت" کے کمالِ فن کا اندازہ بھی ہوتا ہے ۔ اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی میں بھی بڑے کامیاب و کامراں انسان ہیں اور انتہا یہ ہے کہ شاعر ہونے کے باوجود بیگم کی نگاہ میں صاحبِ اعتبار و وقار ٹھہرے ہیں ۔

زیدی صاحب نے شعر و ادب کی آغوش میں آنکھ کھولی ہے ۔ بچپن میں بزرگوں

کو شعر و ادب کا دلدادہ دیکھا لیکن ہوش سنبھالا اور پاکستان آئے تو ایک طویل عرصے تک شعر و شاعری سے بیگانہ رہے لیکن تخلیق کا شعلہ اپنے اظہار کا موقعہ تلاش کرتا رہا اور پھر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک اُٹھا۔ پہلا مرثیہ ڈاکٹر یاور عباس مرحوم کے یہاں پڑھا۔ خدا جنت نصیب کرے موحوم کو نو تصنیف مراثی کی مجالس کا سلسلہ کراچی میں اُنھیں کے یہاں اور اُن کی ذاتی کوششوں سے شروع ہوا تھا۔ کیا ادب نواز اور دوست پرور انسان تھے۔ راقم الحروف نے ان کے یہاں کی بیشتر مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل کی ہے اور کراچی کے اُن تمام بزرگ اور نئے مرثیہ گو حضرات کو سُنا ہے جو ڈاکٹر صاحب کی محبت میں یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ نو تصنیف مراثی کی مجلسوں کا یہ سلسلہ ایک اہم شعری آزمائش کی حیثیت بھی رکھتا تھا کہ جس نئے شاعر نے یہاں بخیر و خوبی مرثیہ پڑھ لیا وہ گویا مرثیہ گوئی میں پختہ ہو گیا۔ اُستادانِ فن کا مجمع ہوتا تھا جو ہر مصرعے کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ اُن کی نگاہ میں اعتبار حاصل کرنا اور اُن کے معیار پر پورا اُترنا بڑا مشکل کام تھا اس وجہ سے نئے شاعر بڑی احتیاط برتتے تھے۔ زیدی صاحب ان مجالس میں بظاہر نئے شاعر تھے لیکن شعر و ادب کی آغوش میں پرورش پانے کی وجہ سے اُنھیں دوسرے شعرا پر فوقیت حاصل تھی چنانچہ اُنھوں نے مرثیہ ہی نہیں لکھا بلکہ غزل کی طرف بھی توجہ کی اور جلد ہی غزل گو کی حیثیت سے بھی معروف ہو گئے۔ لیکن ریاض خیرآبادی کی طرح بازگشتِ شباب تقدیر میں تھی لہٰذا پیری میں جوان ہونے امریکہ سدھار گئے اور اب وہیں شاد و آباد ہیں اللہ تعالیٰ اُنھیں شاد و آباد رکھے۔

زیدی صاحب کی پہلی ہجرت غیر اختیاری لیکن ہجرتِ ثانی اختیاری تھی۔

"لیے پھرتی ہے کہیں ایک توقع غالب" مگر یہ گیشش کافِ کرم والا سلسلہ نہیں تھا۔ زیدی صاحب نے اس سلسلے کو بڑے درد اور دُکھ کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

ہم وہی بدنصیب ہیں جن کا　　اک ٹھکانا نہیں ٹھکانے کا

ٹھکانے کا ٹھکانا دراصل ایک ایسی ذہنی کیفیت کا نام ہے جس میں طمانیت آسودگی خاطر اور نفسیاتی سرور مادی اضطراب پر غالب آجاتا ہے اور بدنصیبی کا احساس ختم ہوجاتا ہے۔ ٹھکانے کا ٹھکانا وہ نہیں ہوتا جہاں مادی آسائشیں سبھی موجود ہوں لیکن دل میں تنہائی کا کرب اور ایک انجانا خوف پرورش پاتا رہے۔ جہاں سب کے رسم و رواج اور سب کے مزاج ایک دوسرے سے الگ ہوں۔ زیدی صاحب کے بقول ؎

رسم و رواج سب کے الگ ہیں مزاج الگ
سب لوگ اپنے اپنے قبائل سے آئے ہیں

اور یہ رسم و رواج اور مزاج الگ ہی رہتے ہیں۔ گھُل مل کر ایک نہیں ہوتے۔ ان کی شیرازہ بندی ممکن نہیں۔ بندش کی گیاہ کہاں سے آئے اور کس طرح فراہم ہو۔ جہاں بندش کی گیاہ موجود تھی وہاں بھی شیرازہ بندی نہ ہوسکی اور پچاس برس ہی میں مزاجوں اور طبائع کا فرق صاف ظاہر ہوگیا۔ زیدی صاحب نے دیارِ غیر میں آباد ہوکر اس فرق کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ اس فرق کا احساس اُن تمام شاعروں کے یہاں ملتا ہے جو زیدی صاحب کی طرح دیارِ غیر میں زندگی گذار رہے ہیں۔ زیدی صاحب نے کوشش کی ہے کہ جہاں رہیں سلسلۂ مہر و محبت کو عام کرتے رہیں اس کوشش کو انھوں نے فریضۂ حیات قرار دے رکھا ہے مگر میرا خیال ہے کہ کوشش اپنی جگہ کامیابی اپنی جگہ۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم نہیں ہیں اُنھوں نے

ایک جگہ کہا ہے ؎

ہم اپنے فرائض سے خبردار رہے ہیں ہر قــریۂ بے مہر میں بانٹی ہے محبّت

قریۂ بے مہر کہہ کر شاعر نے اپنی کوشش کی ناکامی کا اعتراف کر لیا ہے۔ فرائض کے احساس اور بجا آوری سے رسمِ محبت عام نہیں ہوتی نہ قریۂ بے مہر کا مزاج بدلتا ہے بلکہ کبھی کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ قریۂ بے مہر کی بے مہری فرض انجام دینے والے کی ذہنیت پر غالب آ کر اُسے دستورِ محبت سے بیگانہ نہ کر دے۔ ممکن ہے کہ یہ کیفیت آج رونما نہ ہو لیکن کل اس کے عمل دخل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ویسے قریہ بے مہر میں محبت بانٹنے کے جذبے کو باقر زیدی نے ایک اور جگہ زیادہ خوبصورت اور سبک انداز سے پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہماری بات نہ پوچھو عجیب لوگ ہیں ہم
کہ شاخِ خشک پہ تازہ گلاب مانگتے ہیں

تازہ گلابوں کے لیے شاخ بھی تر و تازہ اور زندہ ہونا چاہیے۔ زیدی صاحب اُن شاخوں میں گلابوں کی جستجو کر رہے ہیں جو بظاہر تر و تازہ لیکن اُن کے ذہنی اور روحانی معیار سے مُردہ اور خشک ہیں۔ یہ مسئلہ صرف زیدی صاحب ہی کا نہیں بلکہ اُن جیسے بے شمار شاعروں اور ادیبوں کا ہے جو اصل دھارے سے کٹ گئے ہیں مگر اصل دھارے کے زور و شور۔ روانی اور پاکیزگی کے جویا ہیں۔ ان کا ایک شعر اس حوالے سے میں نے بار بار پڑھا اور ہر بار ایک نیا لطف محسوس کیا ؎

خوشی سے وہ در و دیوار جھومتے ہوں گے
مکین لوٹ کے آتے ہیں جن مکانوں کے

عجیب کیفیت ہے مکینوں کے لوٹ آنے پر درو دیوار کا خوشی سے جھومنا در اصل استعارہ ہے اُس غیر معمولی طمانیت اور سرخوشی کا جو کسی غریب الوطن کو وطن واپس آکر اپنے مکان میں داخل ہوتے وقت محسوس ہوتی ہے۔ بڑا سچا اور معنویت سے بھرپور شعر ہے۔ یہاں شاعر کے مشاہدے۔ تجربے اور زندگی کے ادراک۔ ماضی اور حال کی آمیزش اور سُرور و اَلَم نے مِل جُل کر ایک آفاقی صداقت کا روپ دھار لیا ہے۔ باقر زیدی صاحب کے یہاں اِس انداز کے شعر جا بجا ملتے ہیں۔ اُنھیں یہ احساس بھی ہے کہ اُن کا دُکھ اُن کا انفرادی دُکھ نہیں۔ اسے اجتماعی حیثیت اور اہمیت حاصل ہے کہ یہ سچا دُکھ ہے۔ حساس انسان کا دُکھ ہے۔ فاصلے کم ہو جانے کے اِس سفر اور مسافر نواز عہد میں بھی دوری کا احساس اور مسافرت کا صدمہ سب کے لیے یکساں ہے۔ اِسی لیے انھوں نے کہا ہے ؎

میرا ہی دُکھ تو سارے قبیلے کا دُکھ ہوا
میری دُعا سبھی کی مناجات ہو گئی

زیدی صاحب محتاط اور بااصول غزل گو ہیں۔ خاندانی اور گھریلو اثرات نے اُن کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ پیدا کیا ہے لیکن وہ کلاسیکی انداز کے اسیر نہیں ہوئے جدید تقاضوں سے بھی پوری طرح باخبر ہیں اور اُنھیں اپنی غزل میں بڑے سلیقے سے برتتے ہیں۔ اُن کی غزل ذاتی جذبات و واردات۔ مشاہدے اور تجربے سے عبارت ہے۔ جا بجا تغزل کے بلیغ اور پُرکار اشارے بھی ملتے ہیں مثلاً ؎

پاسِ مزاجِ حُسن سے چپ ہو کے رہ گئے
تھے لفظ بھی زباں پہ زباں بھی دہن میں تھی

مولانا حسرت کی زمین میں زیدی صاحب کی یہ پوری غزل رنگ اور خوشبو کی ایک لہر معلوم ہوتی ہے۔

میری رائے میں زیدی صاحب اور اُن کی طرح کے دوسرے شاعر جو شعروادب کے مراکز سے دور رہ کر شاعری کا چراغ روشن رکھتے ہیں بڑی مفید ادبی اور قومی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اُن کی کاوشوں سے اُردو شاعری کا اُفق وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ شاعری میں ایک نیا طرزِ احساس اُبھر رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آئندہ ایک بالکل نیا اور خوشگوار لہجہ اُردو شاعری کی دل کشی میں اضافے کا باعث بن جائے۔ یہ اضافہ زیدی صاحب کے اُس خواب کی تعبیر ہوگا جو اُنھوں نے اپنی شاعری کے توسط اور اثر سے دیکھا ہے۔ میں اِس مجموعے کی اشاعت پر اُنھیں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ انھوں نے سچ ہی تو کہا ہے ؎

کہاں ارضِ پاک اور کہاں ایمریکہ
کہاں آکے بکھری ہے مٹی کہاں کی

مگر یہ مٹی ہے بہت زرخیز۔ نجانے کیسے کیسے گل و لالہ اس سے نکلیں گے۔

ڈاکٹر اسلم فرّخی

لذتِ گفتار کا شاعر

ہر معاشرے کا ایک تاریخی، تہذیبی تسلسل ہوتا ہے۔ جو افراد اس کا حصہ ہوتے ہیں ان میں دو قسم کی شناخت واضح ہے۔ ایک وہ جو نادانستہ یا غیر شعوری سطح پر اس سے وابستہ رہتے ہیں اور دوسرے وہ جو دانستہ اور شعوری سطح پر اس سے اپنے تعلق کو محسوس کرتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ اور کلچر کے تمام مظاہر موخرالذکر افراد کے مرہونِ منت ہوتے ہیں انہی کے محسوساتی، نفسیاتی، ذہنی اور وجدانی ردعمل ہی سے اظہار کی مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں۔

باقرؔ زیدی سے میری ذاتی واقفیت نہیں لیکن ان کا نثر پارہ "خامشی سے لذّتِ گفتار تک" پڑھ کر اور ان کی غزلیات کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ بھی اسی تہذیبی گروہ میں شامل ہیں جس کا میں نے سطور بالا میں تذکرہ کیا ہے۔ باقرؔ زیدی صاحب کے ذاتی کوائف سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ شعر و سخن کی روایت اُن کے بزرگوں سے چلی آرہی ہے۔ اُن میں شعر گوئی کا جوہر تھا جسے علامہ طالب جوہری کی ترغیب نے ایک مستقل صورت دے دی۔ باقرؔ زیدی نے ریاضؔ خیرآبادی اور جگرؔ مرادآبادی کے حوالے سے شاعری میں "حال و قال" کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ مجھے اس پر

ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کی وہ بحث یاد آگئی جو انھوں نے اس باب میں کی ہے کہ شاعری شخصیت کے اظہار کا نام ہے یا گریز کا؟ نیز ذاتی کوائف کی روشنی میں کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ ایلیٹ صاحب نے تو ہر دو معاملات میں روایتی تصورات شعر و سخن کی نفی کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ شاعری شخصیت سے گریز بلکہ اس کی مکمل نفی کا نام ہے۔

تاہم ہماری روایاتِ شعر میں تہذیبی، تاریخی اور ذاتی حوالوں کی ہمیشہ سے اہمیت رہی ہے۔ یہ حوالے اس وقت اور بھی اہم اور شدید ہو جاتے ہیں جب باقر زیدی جیسے اہلِ قلم ہجرتوں اور ترکِ سکونت کے تجربوں سے گزر رہے ہوں۔ اب اُردو ہی کے توسط سے اس موضوع پر اچھا خاصا تحقیقی کام کیا جا سکتا ہے۔ ساقی فاروقی، عبدالقوی ضیا، حنیف آذر دلی عالم شاہین، اشفاق حسین، خالد سہیل، صبیحہ صبا، حمیرا رحمٰن، نسیم سید، افتخار نسیم اپنی اپنی اسلوب میں ان تجربوں کی گرفت کا احساس دلاتے ہیں۔ نئی دُنیا میں جو مسائل اقدارِ حیات کی نسبت سے پیش آتے ہیں وہ بھی NOSTALGIA (ناسٹلجیا) کا خاصا سامان مہیا کر دیتے ہیں۔ پھر جذباتی، نفسیاتی اور جمالیاتی سطح پر شاعرانہ ردِ عمل کچھ یوں ظاہر ہوتا ہے جیسا باقر زیدی کے ان اشعار میں ہوا ہے ؎

اس دشتِ رنگ و نور میں بھولی نہیں ابھی
سادہ سی زندگی جو دیارِ وطن میں تھی

اس کو کس طرح کہیں شہرِ محبت کہ یہاں
اک عمارت بھی نہیں تاج محل کی صورت

ایسی تہذیب سے کیا ربط ہو اپنا کہ جہاں
اک بڑا عیب ہو لڑکی کا کنواری ہونا

اِس قسم کے شاعرانہ اظہار سے ہماری اُردو شاعری کو پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن سچے تخلیقی ذہن کی تو پہچان ہی یہ ہے کہ وہ انہی تجربوں کو جمالیاتی پیکر عطا کرے جو اس کی ذاتی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ اس عمل کا احساس ایک فطری شاعر کو ہر وقت رہتا ہے اور وہ خود اپنا محاسبہ بھی کرتا رہتا ہے کہ اس جمالیاتی عمل میں وہ کہاں تک کامیاب رہا ہے ؎

خدا ہی جانے وہ پیکر جو میرے ذہن میں تھا
بنا سکا کہ ابھی تک بنا نہیں پایا

باقر زیدی اُردو کی قدیم و جدید شاعرانہ روایات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میر و غالب تو اُن کے شعری مثالیوں میں شامل ہیں لیکن بیسویں صدی کے شعرا سے بھی ان کا ذہنی اور تخلیقی رشتہ قائم رہتا ہے۔ ان کی غزل میں وہ سارے مضامین ملتے ہیں جو زہد و پارسائی، دوستی و دشمنی، نور و ظلمت، انصاف و ناانصافی، بہار و خزاں، باطن و ظاہر کے معاشرتی ٹکراؤ کا نتیجہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کیفیات اپنے روایتی مفاہیم رکھنے کے علاوہ علامتی اور رمزیہ جہات کی حامل بھی ہیں اور انھی کے توسط سے آج کا شاعر بھی گفتنی اور ناگفتنی کو انفرادی طور پر بیان کر سکتا ہے۔ اسی سے کلام میں مانوس اور نامانوس کا ایک امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ کلام کا تنوع بھی اس سے عبارت ہے۔ باقر زیدی کے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

شاعری کیا ہے اک بہانہ ہے ان کہی داستاں سنانے کا
جو تمھیں روز یاد کرتے ہیں شکریہ اُن کو بھول جانے کا

گھر کو صحرا کہے کہ دشت کو گھر　　کیا کرے گا کوئی دوانے کا

فنِ تعمیر کے شہکار بھی دیکھے ہیں بہت　　اور پھر کٹتے ہوئے دستِ ہُنر دیکھے ہیں

ہم کو دشمن کی بھی تکلیف گوارا نہ ہوئی　　لوگ احباب سے بھی صرفِ نظر کرتے ہیں

مرقدوں پر تو چراغاں ہے شب و روز مگر　　عمر کچھ لوگ اندھیروں میں بسر کرتے ہیں

آشفتہ سروں کے لیے گھر کب تھے مناسب　　صحرا میں جو وسعت تھی، مکانوں میں کہاں تھی

یہ رات بھی وسواس سے یہی ہوئی گزری　　کیا جانیے کیا صبح کے اخبار میں آوے

سب بستیاں ہیں لطف و عنایات کے لیے　　میرا ہی شہر کیوں ہے فسادات کے لیے

آج ممکن نہیں مطلب کے خداؤں کا شمار　　صرف بُت ہی نہیں، لوگوں کے خدا اور بھی ہیں

میرا خیال ہے کہ ایسے اشعار کسی بھی شاعر کی انفرادیت کا تعین کرنے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔ باقرؔ زیدی نے ذاتی، تہذیبی اور نفسیاتی کیفیات کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے معاشرتی اور سیاسی حقائق سے بھی اپنا ذہنی رشتہ استوار رکھا ہے۔ وہ اگرچہ اپنی روایات کے منطقے سے جغرافیائی طور پر دور ہیں لیکن ان کے تخلیقی سفر میں وہ نشیب و فراز بھی برابر آتے ہیں جن سے زندگی کے موسموں کی پیمائش کی جا سکتی ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ باقرؔ زیدی کے ذہن میں ایک معیارِ سخن ہے۔ جو ان کے آئندہ شعری ارتقا کی ضمانت بن سکتا ہے۔

سحر انصاری
صدر شعبہ اُردو
کراچی یونیورسٹی

عہدِ حاضر کی شاعری

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ الفاظ کے خوبصورت انتخاب، فکر کی بلندی اور مشاہدے کی فراوانی ہی سے اچھی شاعری جنم لے سکتی ہے۔ ایسی شاعری قاری کے دل اور دماغ دونوں کو اپنے احاطۂ اثر میں لینے پر قدرت رکھتی ہے۔ اور وہ اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ باقر زیدی صاحب کی شاعری میں یہ کمال بدرجۂ اتم موجود ہے۔
یعنی ان کی شاعری دلوں ہی کو مسخر نہیں کرتی بلکہ ذہنوں کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسی ہی شاعری سے مسلسل نمو پانے اور ترقی کرنے کی امید کی جا سکتی ہے یہی وہ شاعری ہے جو ہمارے عہد کی نمائندگی کر سکتی ہے اور ہماری شعری روایات کو آگے بڑھانے میں ممدّ و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

باقر زیدی صاحب بلاشبہ امکانات کے شاعر ہیں وہ عصری تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں ان کی شاعری ہوا میں معلّق نہیں بلکہ زمین کا ذائقہ چکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ روایتوں کے چاک سے جب وہ شعری ظروف ڈھال کر انھیں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں تو ان کی صورت بھی عام ڈھلے ہوئے ظروف سے مختلف ہوتی ہے اور کھنک بھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے نہیں سوچتے اور نہ ہی سوچ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ بلکہ ان کے مشاہدے کی زد پر جو منظر آجائے وہ اسے پوری سچائی سے شعری پیکر میں سمونے کا ہنر جانتے ہیں۔ میرے اس دعوے کا ثبوت زیرِ نظر مجموعہ "لذّتِ گُفتار" ہے۔

میں پُر امید ہوں کہ "لذّتِ گُفتار" کی اشاعت شمالی امریکہ ہی میں نہیں بلکہ پوری اُردو دنیا کے ادبی سرمایے میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوگی۔ اور شعری ادب کا اچھا ذوق رکھنے والے اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔

عابد جعفری
ٹورنٹو

آج کا شاعر

بعض شاعروں کو ایک مدت تک پڑھنے اور سننے کے بعد بھی یہ احساس رہتا ہے کہ سنِ بلوغت کی طرف ان کا سفر ابھی جاری ہے۔ مگر باقر زیدی کی شاعری کا آغاز ہی سنِ بلوغ کا حسن و جمال اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان کے بالغ النظر ہونے پر تو کسی کو شک نہیں مگر لذّتِ گُفتار کو دیکھ کر آپ مری اس رائے سے بھی اتفاق کریں گے۔

باقر زیدی کے اندر بچپن سے ایک شاعر موجود تھا، مگر غمہائے روزگار نے انھیں اسے پسِ نقاب رکھنے پر ایک طویل مدت تک مجبور رکھا۔ ہوسکتا ہے کہ شاعروں کے ساتھ زمانے کی مجرمانہ غفلت اور ناقدر شناسانہ سلوک اس کا سبب ہو۔ سبب چاہے کچھ بھی ہو میں انھیں خود پر اس جبر و تشدد کی داد دیتا ہوں ــــ "لذتِ گُفتار" میں مختلف المزاج اور مختلف الادوار غزلوں کو دیکھ کر میں یہ کہنے پر حق بجانب ہوں کہ

باقر زیدی نے شعر کہے بغیر ہر دور میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں پر جلاکاری کے عمل میں بچپن سے تادمِ آغاز غفلت نہیں برتی۔ کوئی کیا جانے حکیم عطا نے مہہِ نخشب کی تخلیق میں کتنی عمر پس پردہ زنگاری صرف کی۔ بقول باقر زیدی انھوں نے اپنے والدِ مرحوم معروف شاعر جناب فیض بھرتپوری کی وفات کے بعد (جس کو ابھی بہت مدت نہیں ہوئی) شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ان کی پہلی غزل کے دو شعر جن سے ان کی بلوغتِ شعری کا پتہ ملتا ہے درج کرتا ہوں۔ دیکھئے جو ان کا نقطۂ آغاز ہے، بہت سے شعراء کے لیے منزل نظر آئے گی اور یہاں مری مراد ان متشاعروں سے نہیں ہے جو شعراء کی میزبانیوں اور انجمن سازیوں کی وجہ سے شاعر ہو گئے ہیں ؎

سوچئے تو ہر آدمی تنہا — دیکھئے تو رفاقتیں بھی بہت

شہر ناپرساں اور ہم باقر — دل نے پائیں فراغتیں بھی بہت

سید احتشام حسین نے کہا آج کے شاعر نے غزل کے اندرونی حسن کا راز پالیا ہے۔ وہ اس پر زیادہ بوجھ ڈالے بغیر معمولی شائستگی سے سجا کر اسے حسین بنا دیتا ہے۔ بس آج کے شاعر کا نام باقر زیدی بھی ہے۔ ہر چند کہ ان کا سفر جاری ہے مگر ان کی منزل ع " ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں " کے مصداق دور ہے، جذبات کا سیلاب ایک مدت تک قید رہنے کے بعد جب اذنِ اظہار پاتا ہے تو ہر بندش توڑ کر نکل جاتا ہے۔ امید ہے باقر زیدی بھی ہر بندش اور رکاوٹ کو توڑ کر اپنی منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ انشاء اللہ

شہاب کاظمی۔ ایم اے اُردو ادب

○

بالا نشینِ مسندِ دربار ہم نہ تھے
شاہوں کی سلطنت کے وفادار ہم نہ تھے

نقدِ سخن تھے حرفِ سبکسار ہم نہ تھے
غالب کے قدر داں تھے طرفدار ہم نہ تھے

ایسا نہیں ہوا کہ سزاوار ہم نہ تھے
مانا کہ اُس قبیلے کے سردار ہم نہ تھے

وہ حُبِ ذات جس نے ڈبویا ہے قوم کو
اُس لشکرِ اَنا کے علمدار ہم نہ تھے

ہم نے تو اپنے حق کا تقاضا نہیں کیا
بے جا عنایتوں کے طلبگار ہم نہ تھے

عزت کی زندگی کی تو خواہش ضرور کی
لیکن حریصِ منصب و دستار ہم نہ تھے

اس شہرِ بے اماں میں سچ کون بولتا
چپ ہو گئے کہ میثم تمار ہم نہ تھے

اللہ جانتا ہے سمیٹی نہیں گئیں
اتنی محبتوں کے سزاوار ہم نہ تھے

محفل سے اس نے یُں اٹھایا تو تھا مگر
پھر آ گئے کہ اتنے بھی خوددار ہم نہ تھے

○

دل پہ کرتے ہیں دماغوں پہ اثر کرتے ہیں
ہم عجب لوگ ہیں ذہنوں میں سفر کرتے ہیں

جب سراپے پہ کہیں اس کے نظر کرتے ہیں
میر صاحب کی طرح عمر بسر کرتے ہیں

بندشیں ہم کو کسی حال گوارا ہی نہیں
ہم تو وہ لوگ ہیں دیوار کو در کرتے ہیں

وقت کی تیز خرامی ہمیں کیا روکے گی
جنبشِ کلک سے صدیوں کا سفر کرتے ہیں

نقشِ پا اپنا کہیں راہ میں ہوتا ہی نہیں
سر سے کرتے ہیں مہم جب کوئی سر کرتے ہیں

ہمنشیں خوب ہے یہ محفلِ یاراں کہ یہاں
وہ سلیقہ ہے کہ عیبوں کو ہُنر کرتے ہیں

کیا کہیں حال ترا اے متمدن دُنیا
جانور بھی نہیں کرتے جو بشر کرتے ہیں

ہم کو دُشمن کی بھی تکلیف گوارا نہ ہوئی
لوگ احباب سے بھی صرفِ نظر کرتے ہیں

مرقدوں پر تو چراغاں ہے شب و روز مگر
عمر کچھ لوگ اندھیروں میں بسر کرتے ہیں

تذکرہ میر کا غالب کی زباں تک آیا
اعترافِ ہُنر اربابِ ہُنر کرتے ہیں

○

مہ جبینوں کے اعتبار میں ہوں
میں خزاں میں نہیں بہار میں ہوں

وضعِ تہذیب انکسار میں ہوں
اپنے اسلاف کے شعار میں ہوں

اُس کی شاخیں ہیں آسمانوں پر
وہ شجر جس کے برگ و بار میں ہوں

عمر گذری ہے ہجرتیں کرتے
بے زمینی کے خلفشار میں ہوں

کیا عجب ہے یہ اجنبی ماحول
جیسے میدانِ کارزار میں ہوں

کم نہیں ہوتی دُوری منزل
ایک مدت سے رہگذار میں ہوں

اپنا سمجھا نہیں ہے اپنوں نے
غیر کی چشمِ اعتبار میں ہوں

میری بے اختیاریاں مت پوچھ
جانے کس کس کے اختیار میں ہوں

اور کس گھر کو گھر کہوں اپنا
بے دیاری ترے دیار میں ہوں

گردشیں میرا کیا بگاڑیں گی
ماں کے کھینچے ہوئے حصار میں ہوں

اُس کو سب میرے حال کی ہے خبر
کوئی ہے جس کے انتظار میں ہوں

○

دیارِ حسن و حصارِ دل و نظر میں رہا
میں جس نگر کا مکیں تھا اُسی نگر میں رہا

جو خوش نصیب محبت کی رہگذر میں رہا
وہ بوئے گُل کی طرح دامنِ سحر میں رہا

ہر اک وجود کسی حلقۂ اثر میں رہا
کسی پہ دھوپ کوئی سایۂ شجر میں رہا

یہ اور بات کہ قاتل کا کچھ پتہ نہ چلا
ہمارے قتل کا چرچا تو شہر بھر میں رہا

بچھڑ گئے سرِ منزل جو ساتھ نکلے تھے
یہ سانحہ بھی مری عمرِ مختصر میں رہا

عقیدتوں نے سجایا اسے جبینوں پر
نشانِ سجدہ گذاراں نہ سنگِ در میں رہا

ہُنر کا حسن تھا جامِ سفال میں بھی مگر
کمالِ کوزہ گری دستِ کوزہ گر میں رہا

یہ میرا گھر ہے یہاں لوگ میرے اپنے ہیں
یہی خیال تو تزئینِ بام و در میں رہا

وصال جس کو مُیسر ہوا وہ بعدِ وصال
درازدستیِ آسائشِ دِگر میں رہا

دعائیں کرتے ہوئے عمر کٹ گئی میری
ہر اک دعا کا اثر راہِ بے اثر میں رہا

نجانے میرا مقدر ہیں ہجرتیں کتنی
بس چار دن بھی سکوں سے نہ ایک گھر میں رہا

نئے افق نئے امکاں اسی سے روشن ہیں
وہ اعتبار جو تسخیرِ بحر و بر میں رہا

دیئے جلا کے میں رکھ آیا رہگذاروں پر
جو میرے گھر کا اندھیرا تھا میرے گھر میں رہا

کوئی بتائے کہ میں اس کو کیا کہوں باقرؔ
جو ہمسفر بھی نہ تھا اور مرے سفر میں رہا

○

دھوپ کے ستقر میں رہتا ہوں
سایہ بن کر شجر میں رہتا ہوں

حُسن کے بام و در میں رہتا ہوں
میں اِسی ایک گھر میں رہتا ہوں

ذکرِ خیر البشر میں رہتا ہوں
مستقل رفعت میں رہتا ہوں

حسنِ ذوقِ نظر میں رہتا ہوں
آب ہوں میں گہر میں رہتا ہوں

پھول ہوتے ہیں ہمنشیں میرے
خوشبوؤں کے نگر میں رہتا ہوں

اعتبارِ سحر نہیں لیکن
انتظارِ سحر میں رہتا ہوں

جانتا ہوں سیاستوں کا مزاج
میں بھی اہلِ خبر میں رہتا ہوں

آپ ہی سا مزاج ہے میرا
آپ ہی کے نگر میں رہتا ہوں

دوستوں کی نوازشیں ہیں بہت
دشمنوں کی نظر میں رہتا ہوں

مجھ میں کوئی ہُنر تلاش نہ کر
حلقۂ بے ہُنر میں رہتا ہوں

جس سے پیشانیاں دمکتی ہیں
میں اسی سنگِ در میں رہتا ہوں

نسل آئندہ فصل ہے میری
میں پدر ہوں پسر میں رہتا ہوں

حُسن کے بھی بڑے ٹھکانے ہیں
میں بھی کب ایک گھر میں رہتا ہوں

○

بوجھ کوئی نہ اپنے دل پر لو
ہم تمھیں ہو گئے میسر لو

رات بھی تو سفر میں ہوتی ہے
ساتھ میں کوئی ماہ پیکر لو

ہم محبت لُٹانے والے ہیں
تم بھی چاہو تو اپنا گھر بھر لو

کان دیوار کے بھی ہوتے ہیں
نام جس کا بھی لو سنبھل کر لو

چشمِ ساقی سے ہو گیا مدہوش
ہاتھ سے بادہ کش کے ساغر لو

اور ہے اِس کے ٹوٹنے کا مزہ
شیشۂ دل پہ کوئی پتھر لو

تم کو آسیب کا بھی خوف نہیں
شام ہوتی ہے سر پہ چادر لو

قبر کی بھی جگہ نہ پاؤ گے
رہ گیا ہے یہی سمندر لو

تم تو رہتے ہو شیش محلوں میں
تم نہ ہاتھوں میں اپنے پتھر لو

چند باتیں اِدھر اُدھر کی کہیں
اور ہم ہو گئے سخنور لو

○

اب وہ اگلے سے ستمگر نہیں آتے دیکھے
اب سنانوں پہ کہیں سر نہیں آتے دیکھے

آنکھ کے تل میں سما جاتی ہے دنیا ساری
کبھی سیپی میں سمندر نہیں آتے دیکھے

ہر ہتھیلی ید بیضا نہیں بنتے دیکھی
ہر گواہی کو تو کنکر نہیں آتے دیکھے

خود ہی رکھنا ہے ہمیں گھر کی حفاظت کا خیال
اب ابابیلوں کے لشکر نہیں آتے دیکھے

اب کسے دیکھئے میراث ہُنر ملتی ہے
سب میں اسلاف کے جوہر نہیں آتے دیکھے

ہر زمانے کا الگ طرزِ پذیرائی ہے
اب کہیں عشق پہ پتھر نہیں آتے دیکھے

وہ سخن نکلے تو شاعر کی زباں سے نکلے
جو زمانے کے لبوں پر نہیں آتے دیکھے

کچھ تو ہم سے بھی خدا کو ہے توقع شاید
ہم جو آئے تو پیمبر نہیں آتے دیکھے

دستِ مظلوم میں ظالم کی اجل ہے لیکن
دستِ مظلوم میں خنجر نہیں آتے دیکھے

ہم اگر اور بھی گرتے تو کہاں تک گرتے
خاک پر تو مہ و اختر نہیں آتے دیکھے

جس کو دیکھو وہی مومن وہی غالب وہی میر
کون کہتا ہے سخنور نہیں آتے دیکھے

○

تیر کی کوئی ضرورت ہے نہ شمشیر کی ہے
اب اگر ہے تو فقط ناخن تدبیر کی ہے

جو خطاکار نہیں ہوں وہی مجرم ٹھہریں
یہ بھی اک شکل مرے شہر میں تعذیر کی ہے

زندگی ایک معمہ ہے سلجھتا ہی نہیں
کیفیت اس میں کسی زلفِ گرہ گیر کی ہے

حق سے باطل کی یہ پیکار ہے جب تک جاری
ایک ہی راہ عمل مسلکِ شبیرؑ کی ہے

آگے کچھ فرق تو تعمیر میں تخریب میں تھا
اب جو تخریب کی صورت ہے وہ تعمیر کی ہے

کس نے بٹھلایا ہے قرطاس و قلم پر قدغن
کیوں زمانے میں روش بندشِ تحریر کی ہے

کل یہی پابہ سلاسل ہی قفس توڑیں گے
نغمۂ حُرّیت آواز میں زنجیر کی ہے

جس کو بدبختیٔ اوقات نے لکھنے نہ دیا
آج دُنیا کو ضرورت اُسی تحریر کی ہے

شوخیٔ و ندرتِ افکار ہے غالبؔ کا کمال
سوت، درآہنگ کو دیکھو تو غزل میرؔ کی ہے

○

ذکر اُس کا اگر پیکرِ اشعار میں آوے
کیا کیا نہ مزہ لذتِ گفتار میں آوے

مطلوبِ نظر چشمِ طلبگار میں آوے
سورج کی طرح روزنِ دیوار میں آوے

رکھا ہے قدم حضرتِ غالب کی زمیں پر
کچھ اور بلندی مرے افکار میں آوے

سچ پوچھو تو مجھ کو بھی وہی وجہ سکوں ہے
وہ چین جو تجھ کو مرے آزار میں آوے

رخصت مجھے کرتے تھے کوئی یہ بھی تو کہتا
پھر لوٹ کے اپنے در و دیوار میں آوے

اوروں کے گناہوں سے بھی تر ہوتا ہے دامن
جس طرح کہ پانی کبھی بوچھار میں آوے

یہ رات بھی وَسواس سے سہمی ہوئی گذری
کیا جانیئے کیا صُبح کے اخبار میں آوے

اُس حسنِ بلاخیز میں اوصاف بہت ہیں
اک وصفِ محبت بھی مگر یار میں آوے

پھر آج مُرتّب ہو کوئی اور فسانہ
پھر کوئی حسیں مصر کے بازار میں آوے

خوابوں کے تسلسل سے تو بوجھل ہوئیں آنکھیں
تعبیر بھی اب دیدۂ بیدار میں آوے

یوں سمجھو کہ غالب سے عقیدت کا اثر ہے
شوخی کی جھلک گر مرے اشعار میں آوے

○

صف میں ہوں جماعت کی نیتِ فرادیٰ ہے
اور میرا مسلک ہے اور میرا جادہ ہے

عزم سعیٔ حق یابی ناحقوں کی بستی میں
کون فیصلہ دے گا کس کا حق زیادہ ہے

راستی کے رستہ پر کیوں قدم نہیں اُٹھتے
بھیڑ بھی نہیں ہوتی راہ بھی کشادہ ہے

مے کشوں کی قسمت میں کیوں ہے اتنی محرومی
جام ہے۔ صراحی ہے۔ میکدہ ہے بادہ ہے

کچھ تو اہلِ دُنیا کی دردمندیاں کم ہیں
کچھ مرے قبیلہ میں پاسِ غم زیادہ ہے

کارِ خلقتِ زن میں مرد کی جو پسلی تھی
عورتوں کے قالب میں آج بھی زیادہ ہے

اہلِ حُسن بھی اکثر ہم سے غزلیں سنتے ہیں
اس ضرر کے سودے میں کوئی تو افادہ ہے

شاہ کی حفاظت ہم کھیل میں بھی کرتے ہیں
مات سے بچانے کو فیل ہے پیادہ ہے

رحمتوں کی بارش سے زحمتوں کا رشتہ کیوں
فصل کی زمینوں پر آب ایستادہ ہے

قدر ناشناسوں میں فکرِ قدر کیا باقر
یوں بھی آپ شاعر ہیں اور مزاج سادہ ہے

○

وہ گرمیٔ احساس بیانوں میں کہاں تھی
جو آگ تھی دل میں وہ زبانوں میں کہاں تھی

آشفتہ سروں کے لیے گھر کب تھے مناسب
صحرا میں جو وسعت تھی مکانوں میں کہاں تھی

بے ربط سے الفاظ تھے اکھڑا ہوا لہجہ
بے ساختگی جھوٹے بہانوں میں کہاں تھی

افکار کشادہ رکھے احساس معطّر
وہ تازہ ہوا بند مکانوں میں کہاں تھی

دہقاں کی محنت جو درخشاں تھی زمیں پر
فصلوں سے نمایاں تھی لگانوں میں کہاں تھی

سیدھی سی کہانی تھی مرے دل کے سفر کی
تالیفِ سخن اپنے فسانوں میں کہاں تھی

عمامۂ و دستار کی تقلید کی یہ رسم
فرزانوں سے نکلی ہے دوانوں میں کہاں تھی

○

فکرِ رزقِ حلال کرتے ہیں
مفلسی ہم کمال کرتے ہیں

اور کیا خوش جمال کرتے ہیں
عہدِ ماضی کو حال کرتے ہیں

کوئی ہم کو تو پوچھتا ہی نہیں
سب اُسی کا خیال کرتے ہیں

نقشِ حیرت ہے آئینہ خود بھی
کسقدر دیکھ بھال کرتے ہیں

ہم تو سبزہ بچا کے چلتے ہیں
لوگ دل پائمال کرتے ہیں

کوئی ملتا کوئی بچھڑتا ہے
اور کیا ماہ و سال کرتے ہیں

کس سے ممکن ہے حُسن کی تعریف
سب اُسی کو مثال کرتے ہیں

نہیں آنا تو پھر نہ آئیں آپ
بند کیوں بول چال کرتے ہیں

جس سے کوئی امید ہوتی ہے
لوگ اُسی سے سوال کرتے ہیں

یوں تو باقرؔ ہیں کب سے پابہ رکاب
دیکھیں کب انتقال کرتے ہیں

○

ترکشِ حُسن میں گر تیرِ جفا اور بھی ہیں
صرف ہم ہی تو نہیں اہلِ وفا اور بھی ہیں

پیکرِ حُسن میں اندازِ ادا اور بھی ہیں
اِس خطا کار سے امکانِ خطا اور بھی ہیں

جو یہ کہتے تھے محبت کا بھرم ہم سے ہے
اُن سے ملنے کو کہا ہے تو خفا اور بھی ہیں

آج ممکن نہیں مطلب کے خداؤں کا شمار
صرف بُت ہی نہیں لوگوں کے خدا اور بھی ہیں

باقرؔ اس دشت نوردی کے مشاغل میں اسیر
ایک ہم ہی تو نہیں آبلہ پا اور بھی ہیں

○

کچھ نہ کچھ مشغلہ ہی رہتا ہے
دل تو دل ہے لگا ہی رہتا ہے

سب خطائیں ہماری ہوتی ہیں
حُسن تو پارسا ہی رہتا ہے

اب انھیں اور کوئی کام نہیں
سامنے آئینہ ہی رہتا ہے

جو نظر بھر کے دیکھ لے اک بار
پھر اُسے دیکھتا ہی رہتا ہے

کون سمجھائے چارہ سازوں کو
زخمِ دِل ہے ہرا ہی رہتا ہے

ناؤ ڈوبے کہ پار لگ جائے
ناخدا ناخدا ہی رہتا ہے

جتنا چاہے وہ اجنبی بن جائے
آشنا آشنا ہی رہتا ہے

رہ نمائی کرے کہ راہ زَنی
رہ نما رہ نما ہی رہتا ہے

بے وفا سے وفا نہیں ہوتی
بے وفا بے وفا ہی رہتا ہے

صرف چہرے بدلتے رہتے ہیں
آئینہ آئینہ ہی رہتا ہے

کوئی اُس کو خُدا کہے نہ کہے
وہ خدا ہے خدا ہی رہتا ہے

جانے کیا ہو گیا ہے باقرؔ کو
ہر گھڑی سوچتا ہی رہتا ہے

○

یہ دنیا میکدہ ہے اس کا یوں ہی کام چلتا ہے
سنبھل کر کوئی گرتا ہے کوئی گر کر سنبھلتا ہے

کہیں جا کر مرے کردار کی صورت نہیں بدلی
کہ آئینہ بدل جانے سے کب چہرہ بدلتا ہے

بساطِ اہلِ دانش کیا ہے بازی گاہ دنیا میں
اُسی کو مات ہوتی ہے جو کوئی چال چلتا ہے

کسی کی ہم نشینی سے کہیں فطرت بدلتی ہے
چمن میں خار بھی رہتا ہے اور پھولوں میں پلتا ہے

بہت دُنیا کے ہم نے روپ اور بہروپ دیکھے ہیں
ہنسی آتی ہے ہم کو جب کوئی چولا بدلتا ہے

یہ سچ ہے سرد کر دیتا ہے جلتی آگ کے شعلے
مگر جب جوش میں آتا ہے پانی بھی اُبلتا ہے

دلِ کم حوصلہ تو وقت پر آگے نہیں بڑھتا
نکل جاتا ہے جب موقعہ کفِ افسوس ملتا ہے

یہ کیسی استقامت کچھ تو آخر آپ بھی بدلیں
زمانے پر نظر کیجے کہ ہر لحظہ بدلتا ہے

لب و رخسار کا اُس کے قصیدہ ہی سہی لیکن
غزل کا شعر اُس پیکر میں ڈھل کر ہی نکلتا ہے

مقابل ظلم ہو پھر موت کی پرواہ کیا کرنا
یہ جذبہ تو ہمارے خوں کی شریانوں میں پلتا ہے

○

ابتدا ہے نہ انتہا ہے کچھ
زندگی کا کوئی پتہ ہے کچھ

ان دنوں بخت نارسا ہے کچھ
چاہتا کچھ ہوں ہو رہا ہے کچھ

حُسن تو بے مثال ہوتا ہے
آپ جیسا بس آئینہ ہے کچھ

ٹوٹنا دل کا بے مزہ تو نہیں
اِس کا تو اور ہی مزہ ہے کچھ

آپ ہی کیجیے علاج اس کا
آجکل دل بجھا بجھا ہے کچھ

ہم ہی جائیں گے دل کے رستے پر
ہم کو اس راہ کا پتہ ہے کچھ

ہے قیامت کے بعد بھی باقی
زندگی تیری انتہا ہے کچھ

شیخ صاحب سے بھی ہے یاد اللہ
رند بھی اپنا آشنا ہے کچھ

الاماں ارتکاز طاقت کا
نشۂ کبر کی دوا ہے کچھ

یہ زمیں مصحفی کی اچھی ہے
کچھ کی تکرار میں مزہ ہے کچھ

○

کبھی کسی پہ نہ ایسا عذابِ جاں گذرے
گلوں کا لمس طبیعت پہ جب گراں گذرے

قدم قدم پہ محبت کے امتحاں گذرے
وہ ہونہار ہمیں تھے کہ کامراں گذرے

مُنافرت کے سفینے یہاں وہاں گذرے
کہیں تو کوئی محبّت کا کارواں گذرے

قسم خُدا کی بڑے ظالموں کو دیکھا ہے
عذاب جن پہ بہت زیرِ آسماں گذرے

محبتوں کے لیے دل کے راستوں پہ چلو
کہ دانشوں کے سفر سعیٔ رائیگاں گذرے

اُس ایک در کے علاوہ جبیں جھکی تو نہیں
مسافتوں میں بہت سنگِ آستاں گذرے

اب اس طرح بھی رکھو اپنی چاہتوں کا بھرم
وہ بات ہی نہ کرو جو اُسے گراں گذرے

خدائے وقت اب اس وقت کا حساب نہ مانگ
وہ روز و شب جو حسینوں کے درمیاں گذرے

چمن میں پھول بھی ہوں گے مگر چمن تو رہے
کہ ہم رہیں نہ رہیں پر یہ انجمن تو رہے

نہ عشق میں وہ تڑپ ہے نہ حُسن کا وہ مزاج
عجب زمانہ ہے باقی کوئی چلن تو رہے

دلوں میں حوصلہ اب بھی ہے ٹوٹ جانے کا
مزاجِ یار میں اگلا سا بانکپن تو رہے

یہ بزمِ اہلِ محبت ہے منفرد ہی رکھو
بتوں کی چاہ میں اندازِ برہمن تو رہے

نہیں ضرورتِ پوشاکِ قاقم و سنجاب
جو بے لباس ہیں ان کے لیے کفن تو رہے

یہ اور بات ہے دستِ رسا گریزاں تھا
مگر احاطۂ امکاں میں خوش بدن تو رہے

سبھی کو راس کہاں تھا زمین سے رشتہ
وطن میں رہ کے بھی کچھ لوگ بے وطن تو رہے

○

ایک تشویش کھائے جاتی ہے
اچھی صورت سبھی کو بھاتی ہے

جب عقیدت فروغ پاتی ہے
پتھروں کو خدا بناتی ہے

اللہ اللہ وسعتِ کونین
میرا دل ہے جہاں سماتی ہے

کیا کہیں اس دَہَن کی شیرینی
غیر کو آشنا بناتی ہے

صحنِ گلشن میں پھول کی خُوشبو
آپ ہی آپ پھیل جاتی ہے

دن کو ہے لطفِ کارِ بے خوابی
رات ہوتی ہے نیند آتی ہے

جب ارادہ ہو کام کرنے کا
کوئی صورت نکل ہی آتی ہے

مذہبی بحث ہے عبث ہم سے
مسئلہ یہ ہمارا ذاتی ہے

بن بلائے کوئی نہیں آتا
بن بلائے تو موت آتی ہے

○

سب بستیاں ہیں لطف و عنایات کے لیے
میرا ہی شہر کیوں ہے فسادات کے لیے

کچھ بے گھروں کے بخت میں دُشنامِ دہر تھے
اور وقف تھی زمین مزارات کے لیے

وقتِ اخیر کیا طلبِ حاجتِ اخیر
اب آئے ہیں وہ ہم سے ملاقات کے لیے

وہ بھی کسی کی یاد نے آخر گنوا دیا
جو وقت رہ گیا تھا مناجات کے لیے

آ گئے کبھی ہم سے لوگ زمانے میں تھے جنہیں
تاریخ ڈھونڈھتی ہے روایات کے لیے

اُس کا کرم کہ سب میرے قدموں میں ڈھیر تھا
مال و متاعِ حُسن مدارات کے لیے

وہ صاحبِ زمانہ و عالم کب آئے گا
دل مضطرب ہے جس سے ملاقات کے لیے

○

جیب و دامن کو تار تار کریں
کچھ تو تسکینِ قلب زار کریں

دوست ہیں آپ یا مرے دشمن
کوئی موقف تو اختیار کریں

جو بھی ہے جھوٹ بول جاتا ہے
کس کی باتوں کا اعتبار کریں

ہجر کی رات کٹ ہی جائے گی
اور کچھ دیر ذکرِ یار کریں

اس قدر پارسائی ٹھیک نہیں
آؤ خود کو گناہگار کریں

○

زمیں بدلے زماں بدلے مکیں بدلے مکاں بدلے
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ یارِ مہرباں بدلے

تعلق توڑنے والے ذرا آہستہ آہستہ
نظر میں سب کی آتا ہے جو کوئی ناگہاں بدلے

یہی اک ذات مستقبل کی نسلوں کی ضمانت ہے
نجانے کیا رہے گا دَہر میں باقی جو ماں بدلے

یقیں کیجے کہ ہم نے وہ بدلنے والے دیکھے ہیں
یہاں چاہا یہاں بدلے وہاں چاہا وہاں بدلے

جو ہم مَسلک نہ ہوں وہ بستیاں تاراج کر ڈالو
کہیں تو جوشِ مذہب سیرتِ چنگیز خاں بدلے

وہ خوفِ انقلابِ وقت کو پیکِ اجل سمجھا
تو پھر یہ بھی نہ دیکھا کس سے لیتا ہے کہاں بدلے

زباں دے کر بھی جب چاہے وہ پھر جاتا ہے وعدے سے
کہ جیسے وقت پر اہلِ سیاست کا بیاں بدلے

سُنا ہے ہوتی ہے ہر آن تبدیلی زمانے میں
مگر یہ ہم تو تب مانیں گے جب وہ جانِ جاں بدلے

مرے بچّو مجھے مایوس ہونے کی ضرورت کیا
وہ قومیں خود بدل جاتی ہیں جن کا نوجواں بدلے

وہی ایثار کا جذبہ وہی اقدار کی باتیں
کوئی بھی دیکھ لے جاکر انھیں باقرؔ کہاں بدلے

○

کوئی صاحب جمال ہو اپنا
ماہ اپنے ہوں سال ہو اپنا

وہ اچانک کبھی جو آ جائے
جانے کیا دل کا حال ہو اپنا

آپ کا زعم بے گناہی ہو
عرقِ انفعال ہو اپنا

اس قدر بھی کبھی قریب آؤ
سانس لینا محال ہو اپنا

جس کو اک ہاں کی بھیک بھی نہ ملے
کیوں وہ دستِ سوال ہو اپنا

سارا عالم اسیرِ وحشت ہے
ہم کو پھر کیا ملال ہو اپنا

ہم ہیں باقرؔ بلا کے ہجر نصیب
دیکھیے کب وصال ہو اپنا

○

تری طلب میں ترے انتظار میں رہنا
خزاں نصیب کا شوقِ بہار میں رہنا

زمانہ دے نہ کہیں جرم بے کسی کی سزا
جو ہو سکے تو کسی کے شمار میں رہنا

وہ خود پسند کسی دل کا حال کیا جانے
جسے عزیز ہو اپنے حصار میں رہنا

جو جانتے ہیں کہ سورج بھی دن سے ڈھلتا ہے
وہ چاہتے ہیں سدا اقتدار میں رہنا

وہی جو دشمنِ جاں ہے خدا کرے اُس کو
کبھی نصیب نہ ہو اختیار میں رہنا

ہوئے ہیں سارے زمانے سے خود جدا باقرؔ
بہُت عزیز تھا اپنے شعار میں رہنا

○

کوئی اپنا ہے یہاں اور نہ وہاں اپنا تھا
اک وہی راحتِ جاں دشمن جاں اپنا تھا

نکہت و رنگ بھی تھے دل کا سماں اپنا تھا
تھی بہار اپنی جگہ رنگِ خزاں اپنا تھا

گھر سے نکلے تو نظر آئے شناسا چہرے
کچھ تو معلوم ہوا کون کہاں اپنا تھا

تھے بہت اور بھی اپنے لیے آزارِ حیات
حُسنِ آزار مگر شوقِ بتاں اپنا تھا

زحمتِ پُرسشِ احوال ہی کب کی اُس نے
اپنے چہرے ہی سے سب حال عیاں اپنا تھا

جو مزے لے کے سناتا تھا جہاں کی باتیں
وہی ہمرازِ حدیثِ دگراں اپنا تھا

جل کے جو راکھ ہوئی نام و نشاں بھی نہ رہا
اُسی بستی میں کبھی کوئی مکاں اپنا تھا

لذّتِ دردِ جگر ہے یہی اُس کی سوغات
ساری دُنیا میں وہی فیض رساں اپنا تھا

○

جو کوئی داستان چھوڑ گئے
اپنا نام و نشان چھوڑ گئے

کارواں منزلوں پہ جا پہنچے
راستوں میں تکان چھوڑ گئے

کیا یہ بستی اُجڑنے والی ہے
لوگ اپنے مکان چھوڑ گئے

چاہتوں کے نگر میں بھی کچھ لوگ
نفرتیں درمیان چھوڑ گئے

کیا کریں گے بھلا یہ تیر انداز
تیر اُٹھائے کمان چھوڑ گئے

لوگ خوددار بھی تو ہوتے ہیں
دھوپ میں سائبان چھوڑ گئے

بیٹیاں ہاریوں کے گھر نہ رہیں
جب وڈیرے لگان چھوڑ گئے

○

وہی تو ایک محبّت کا استعارہ تھا
تبھی تو دشمن جاں۔ جان سے بھی پیارا تھا

کسی کے حُسن پہ ایسا کبھی اجارہ تھا
ہمارا کُچھ بھی نہ تھا۔ اور سب ہمارا تھا

اذان سُنتے ہی مسجد کی سمت دوڑ پڑے
بہُت دنوں میں کسی نے ہمیں پکارا تھا

زمانہ دیکھ لے اس ہمتوں کی پستی کو
وہیں پہ ڈوب گئے ہم جہاں کنارا تھا

نہ اُس سے قطعِ تعلق ہوا نہ بھول سکے
وہ وقت ساتھ میں اس کے کبھی گذارا تھا

جو خالِ رُخ پہ لُٹاتے تھے حضرتِ حافظ
کبھی وہ اپنا سمرقند تھا بخارا تھا

○

غزل میں جو یہ چاشنی ہے زباں کی
عنایت ہے یارانِ شیریں دہاں کی

اِدھر کی اُدھر کی یہاں کی وہاں کی
حسینوں کے دم سے ہے رونق جہاں کی

محبت ہے جس دل میں دُنیا جہاں کی
زمانے میں بس ایک ہستی ہے ماں کی

کوئی دل میں رکھ لے تو جھنجھٹ سے چھوٹیں
ضرورت نہ ہو پھر تلاشِ مکاں کی

چلے جا رہے تھے نہ مقصد نہ منزل
بڑی عمر ہم نے یونہی رائیگاں کی

محبت ہے کس کس کی دل میں نہ پوچھو
فُلاں کی فُلاں کی فُلاں کی فُلاں کی

محبّت محبّت محبّت محبّت
یہی ایک سُرخی ہے ہر داستاں کی

جنھیں راس آہی گئی بے لباسی
اُنھیں کیا ضرورت لباسِ گتاں کی

ہمیں ایسے لوگوں سے مولا بچائے
یہاں پر یہاں کی۔ وہاں پر وہاں کی

نہ پورب نہ پچھم نہ اُتّر نہ دکھن
نہیں ہے کہیں کوئی صورت اماں کی

مقابل پہ طاغوت کے ہے صف آرا
عجب شان ہے قومِ گریہ کناں کی

کہاں ارضِ پاک اور کہاں امریکہ
کہاں آکے بکھری ہے مٹی کہاں کی

حُسن افکار میں بھی ہوتا ہے
میرے اشعار میں بھی ہوتا ہے

یوں ہی بنتے نہیں ہیں دیوانے
وصف کچھ یار میں بھی ہوتا ہے

اللہ اللہ یہ نزاکتِ عشق
کرب اظہار میں بھی ہوتا ہے

صرف پھولوں ہی میں نہیں ہوتا
حُسن تو خار میں بھی ہوتا ہے

صرف چہرے بُرے نہیں ہوتے
عیب کردار میں بھی ہوتا ہے

گو بظاہر نظر نہیں آتا
خون تلوار میں بھی ہوتا ہے

○

وہ جا رہا ہے بچھڑ کر مگر خفا تو نہیں
وگر نہ یوں مجھے مڑ مڑ کے دیکھتا تو نہیں

اِس اقتدار کی کُرسی پہ اتنا زعم نہ کر
نہ بول اتنے بڑے بول تو خدا تو نہیں

ابھی سے سارا زمانہ خلاف ہونے لگا
کسی کا نام زباں سے ابھی لیا تو نہیں

یہ معرفت تو کسی کو نصیب ہوتی ہے
ہر اک مقامِ محبّت سے آشنا تو نہیں

کسی کی ضو سے تو روشن ہے شاہراہِ حیات
جلا ہوا ہے چراغِ وفا بجھا تو نہیں

صدائیں آتی ہیں کوئی نظر نہیں آتا
قریبِ جاں کہیں ارواحِ انبیا تو نہیں

پہنچ ہی جاؤں گا اک روز اپنی منزل پر
فقیرِ شاہِ نجف راہ بھولتا تو نہیں

تمام عمر اسی وسوسہ میں بیت گئی
یہ جاں کا دُکھ بھی کسی سے کہیں کہا تو نہیں

○

اِس نسل نے دیکھے تھے جو خواب اور طرح کے
اِس عہد پہ اُترے ہیں عذاب اور طرح کے

دانش نے دکھائے ہیں سراب اور طرح کے
برسیں گے زمینوں پہ سحاب اور طرح کے

تم سے تو توقع تھی مجھے اور طرح کی
تم بھی مجھے دیتے ہو جواب اور طرح کے

اس عہد میں کچھ اور ہیں جینے کے تقاضے
لطف اور طرح کے ہیں عتاب اور طرح کے

یہ شہرِ نگاراں ہے روش اور ہے اس کی
جرم اور طرح کے ہیں عذاب اور طرح کے

کچھ علمِ ریاضی کا یہاں دخل نہیں ہے
دل والوں کے ہوتے ہیں حساب اور طرح کے

شاعر بھی ضروری تو نہیں ایک سے سب ہوں
ہم اور طرح کے ہیں جناب اور طرح کے

○

زلف و رخسار کی فضاؤں میں
سب ہی ہیں قسمت آزماؤں میں

جانے یہ نسل کیسی نکلے گی
مامتا کی کمی ہے ماؤں میں

کیا کہیں علم و آگہی کا اثر
زہر ہی زہر ہے ہواؤں میں

ہم نے دیکھا ہے حُسن کا جادو
ہم بھی بیٹھے ہیں خوش اداؤں میں

بال جوڑے کے بندھ گئے تو کُھلا
کتنا پانی تھا ان گھٹاؤں میں

کیوں وہ دستِ کشیدہ چھوڑ دیئے
کون یاد آگیا دعاؤں میں

بے ہُنر میں ہُنر دکھاتے ہیں
یہ ہُنر ہے ہُنر نماؤں میں

○

ہمیں تھے اور کوئی اس رہِ عجب میں نہ تھا
کہ سچ کو سچ ہی کہیں حوصلہ یہ سب میں نہ تھا

زباں جو بند رکھی ہے دلوں سے اُمڈا ہے
خموشیوں میں تھا طوفاں۔ کشادِ لب میں نہ تھا

میں تیرے چاہنے والوں میں یوں بھی تھا ممتاز
کہ سب تھے میں ہی تری محفلِ طرب میں نہ تھا

حصارِ فہم میں کس طرح وہ سمائے کہ جو
فسونِ دائرۂ عِلّت و سَبَب، میں نہ تھا

بُہت عزیز ہے مجھ کو اگرچہ دُشمن ہے
جو وار کرنے تو آیا مگر عقب میں نہ تھا

نہ اب وہ تیشہ بدستی نہ چاکداماں ی
اب ایسا کوئی کسی شجرۂ نسب میں نہ تھا

اک ایسا وقت بھی گذرا ہے یاد تو کیجے
بجز ہمارے کوئی آپ کی طلب میں نہ تھا

علیؑ کے یوم ولادت سے چار چاند لگے
یہ حُسن پہلے مہِ کاملِ رجب میں نہ تھا

تمہاری یاد میں باقؔر نے کتنے شعر کہے
دگرنہ ذکر تمہارا کہیں ادب میں نہ تھا

○

جو ہم سے دور کسی اور ہی دیار میں ہے
قریب ہے کہ ابھی یاد کے حصار میں ہے

میں کس طرح کا مکیں ہوں کہ ایک عمر ہوئی
مرا ہی گھر ہے کہ میرے ہی انتظار میں ہے

یہ میرا دل بھی کہاں ہے مرے تصرف میں
بہت دنوں سے حسینوں کے اختیار میں ہے

وہ لوگ خاک اٹھائیں گے فصلِ گل کا مزہ
خزاں کا خوف جنھیں موسمِ بہار میں ہے

نجانے دل کو ہیں مطلوب چاہتیں کتنی
نجانے کتنے حسینوں کے اعتبار میں ہے

سکون کس کو میسر ہے آج کل باقرؔ
تمام نوعِ بشر ایک انتشار میں ہے

○

اِک بہانہ ہے مُسکرانے کا
شوق ہے بجلیاں گرانے کا

سامنے آئے بس وہی جس کو
حوصلہ ہو نظر اُٹھانے کا

آنے والے ہیں پھول شاخوں پر
موسم آیا تمھارے آنے کا

دل میں آنے کے راستے ہیں بہت
کوئی رستہ نہیں ہے جانے کا

اس سے اچھا تو مشغلہ ہی نہیں
کام ہو بس تو دل لگانے کا

جو تمھیں روز یاد کرتے ہیں
شکریہ اُن کو بھول جانے کا

گھر کو صحرا کرے کہ دشت کو گھر
کیا کرے گا کوئی دوانے کا

ہم وہی بدنصیب ہیں جن کا
اِک ٹھکانہ نہیں ٹھکانے کا

جو بھی ہجرت کرے مُہاجر ہے
فرق ہی کیا نئے پرانے کا

اور رندوں کو کچھ نہیں درکار
راستہ دو شراب خانے کا

جو اصولوں پہ جان دیتا ہے
فرد ہوں میں اُسی گھرانے کا

منّتِ ناخُدا نہیں ہوتی
اب ارادہ ہے ڈوب جانے کا

شاعری کیا ہے اک وسیلہ ہے
اَن کہی داستاں سنانے کا

○

کوئی اُمید کوئی التماس رکھتا تھا
جو وقتِ نزع بھی جینے کی آس رکھتا تھا

وہ ہم ہیں جو نظرِ اجتہاد رکھتے ہیں
فقیہ شہر گمان و قیاس رکھتا تھا

جو ناسپاس ہوا اُس کے لطفِ پیہم سے
وہی تو اس کی جفاؤں کا پاس رکھتا تھا

ہزار بار کھُلا ہم پہ اُس کا ننگِ وجود
جو بے لباس بظاہر لباس رکھتا تھا

پکارتے ہیں جسے لوگ کہہ کے دیوانہ
کبھی یہ شخص بھی ہوش و حواس رکھتا تھا

وفا کی جان بنا اہلِ دل کی نظروں میں
وہ تشنہ لب .لبِ دریا جو پیاس رکھتا تھا

تمھارے شہر کی یہ شام اور تنہائی
تمھارے لطف کی باقرؔ بھی آس رکھتا تھا

○

جب کبھی یارِ طرحدار کی باتیں لکھنا
اس کے ہر روز کے انکار کی باتیں لکھنا

جو مری راہ میں حائل ہے بہت مدت سے
اُسی گرتی ہوئی دیوار کی باتیں لکھنا

اک گلستاں سا مہکتا ہے جو اُس پیکر میں
بس اُسی گلشنِ بے خار کی باتیں لکھنا

ہر گھڑی بس اُسے آنکھوں میں بسائے رکھنا
اور پھر حسرتِ دیدار کی باتیں لکھنا

ہم کو جس کے لب و رخسار پریشاں رکھیں
بس اُسی کے لب و رخسار کی باتیں لکھنا

○

وہ اب بھی جانِ تمنّا ہے یار ایسا تھا
کہ اس کا ایک تبسّم بہار ایسا تھا

تمام شہر میں جیسے ہمیں تو سچے تھے
کسی کو ہم پہ کبھی اعتبار ایسا تھا

کوئی اُمید نہ امکاں تھا اُس کے آنے کا
پھر اس کے آنے کا کیوں انتظار ایسا تھا

جو ہم سے کُھل کے مِلا دل میں رکھ لیا اُس کو
ہمارے قـــریۂ جاں کا شعار ایسا تھا

وہ اجنبی تھے جو اِک عمر ایک گھر میں رہے
دلوں میں سب کے انا کا غبار ایسا تھا

اَنا کے دام سے منصور کیسا نکل پاتا
فصیل مِحبــــسِ جاں کا حصار ایسا تھا

تڑپ تڑپ کے گذاری تھی رات باقرؔ نے
نســیمِ صُـــبح ترا انتظار ایسا تھا

○

کچھ دنوں سے اس قدر برہم مزاجِ یار ہے
دیکھیے جس کو وہ مرنے کے لیے تیار ہے

ہم سے کیا پوچھو ہو اپنے چاہنے والوں کا حال
زیست بھی مشکل ہوئی ہے موت بھی دشوار ہے

کس طرح منزل پہ پہنچیں گے الٰہی خیر ہو
پاؤں میں چھالے بھی ہیں رستہ بھی ناہموار ہے

دیکھیے اب کون کرتا ہے بھلا چارہ گری
جس نے دیکھا ہے مسیحا کو وہی بیمار ہے

کتنے فتنے سو رہے ہیں اُس فسونِ جسم میں
سر سے لے کر پاؤں تک اسرار ہی اسرار ہے

میرؔ و سوداؔ کے زمانے کی غزل اس دور میں
شعر گوئی یوں بھی از بسکہ بہت دشوار ہے

اُس جفا پیشہ نے باتقسہ کر دیا آخر یہ حال
کوئی اپنا غیر ہے اب اور نہ اپنا یار ہے

○

مکالمے سے بِلا قیل و قال سے نکلا
نہ مسئلے کا کبھی حل جدال سے نکلا

نہ تھا فراق سے ممکن وصال سے نکلا
بلا کا رنگ مرے خوش جمال سے نکلا

خلوصِ دل کی بھی دنیا عجیب ہوتی ہے
کہ حُسنِ صوت اذانِ بِلال سے نکلا

دُرست رُخ کا تعیّن بڑا ضروری ہے
کب آفتاب کو دیکھا شمال سے نکلا

عجیب ہے یہ عروج و زوال کی منطق
کہ ہر عروج کسی کے زوال سے نکلا

شعارِ اہلِ کرم دیکھنا تھا شاعر کو
بدل کے بھیس فقیروں کے حال سے نکلا

ہمیشہ جہدِ مسلسل ہی چاہیے باقرؔ
نہ کوئی کام فقط عرضِ حال سے نکلا

○

یوسف نہ سہی گرمیٔ بازار رہے ہیں
کچھ لوگ ہمارے بھی خریدار رہے ہیں

وقفِ ہدفِ منصب و دستار رہے ہیں
جو اپنی اناؤں میں گرفتار رہے ہیں

ہر قریۂ بے مہر میں بانٹی ہے محبّت
ہم اپنے فرائض سے خبردار رہے ہیں

مقتول ہیں لیکن ہے مزاج اور ہمارا
ہم اپنے ہی قاتل کے وفادار رہے ہیں

مسجد میں نمازی سے نمازی نہیں ملتا
ہم رند تو یاروں کی طرح یار رہے ہیں

ہم اہلِ قلم اہلِ نظر اہلِ بصیرت
ذہنوں میں رواں صورتِ افکار رہے ہیں

یہ کیا کہ وہی ہم کو مٹانے پہ تُلے ہیں
ہم جن کی محبت میں گرفتار رہے ہیں

حالات بدلنے سے بدل جاتے ہیں رشتے
دُشمن ہیں وہی اب جو مرے یار رہے ہیں

غمخوارئ مظلوم ہے طینت میں ہماری
ظالم سے ہمیں برسرِ پیکار رہے ہیں

○

مسافتوں میں زمانے کی کیا نہیں پایا
مگر حسین کوئی آپ سا نہیں پایا

عطائے خاص رہی ہم پہ خوش جمالوں کی
پر اور بات مزاج آشنا نہیں پایا

خدا ہی جانے وہ پیکر جو میرے ذہن میں تھا
بنا سکا کہ ابھی تک بنا نہیں پایا

ہمیں نہ دیجیے درسِ وفا کہ ہم نے کہیں
کسی کو اپنے سوا با وفا نہیں پایا

قدم قدم پہ محبت نے دستگیری کی
شریکِ حال کوئی دوسرا نہیں پایا

نگاہِ بد سے بچائے خدا کراچی کو
کہ ایک شہر بھی ایسا بسا نہیں پایا

یہ رستخیزِ زمانہ سبھی پہ حاوی تھی
کسے اسیر کسے مبتلا نہیں پایا

عجیب تھی وہ محبت کی زندگی باقرؔ
طلب بھی کچھ نہ کیا اور کیا نہیں پایا

○

فکر میں کچھ بیان میں کچھ ہے
بس اسی درمیان میں کچھ ہے

کوئی آسیب ہے کہ سناٹا
دل کے خالی مکان میں کچھ ہے

اے خلاؤں میں گھورنے والے
کیا کہیں آسمان میں کچھ ہے

اِس زمان و مکاں کا نام نہ لو
اِس زمان و مکان میں کچھ ہے

ہم سے اُمید بے وفائی کی
ایسے بے جا گمان میں کچھ ہے

اے مرے جسم و جان کے دُشمن
آ مرے جسم و جان میں کچھ ہے

جس کو دیکھو وہ آج کل باقسم
وقت کے امتحان میں کچھ ہے

○

یوں بھی ہوتی ہے کبھی ردِّ عمل کی صورت
وہ بگڑتا ہے تو بنتی ہے غزل کی صورت

آج ملنا ہے تو مل کل کا بھروسہ کیا ہے
مختلف ہو نہ کہیں آج سے کل کی صورت

وہ بھی کیا دن تھے خیالِ لب و عارض کے بغیر
ساعتیں تیسنہ گذر جاتی تھیں پل کی صورت

آج ہی آج زمانے میں ہے فردا کیا ہے
شب گذرتے ہی بدل جاتی ہے کل کی صورت

میں خطاکار ہوں انساں ہوں فرشتہ تو نہیں
دیکھتے کیا ہو مری فردِ عمل کی صورت

اُس کو کس طرح کہیں شہرِ محبّت کہ یہاں
اِک عمارت بھی نہیں تاج محل کی صوُرت

وہ مکیں تھے تو یہ دل لگتا تھا کیسا آباد
یہ وہی گھر ہے کہ ہے دشتِ وجبل کی صورت

جانِ شاعر بھی وہی جانِ تغزل بھی وہی
اس کے پیکر سے نکلتی ہے غزل کی صوُرت

مسئلے ہوں تو نکل آتے ہیں حل بھی باقرؔ
اپنی پیشانی نے دیکھی نہیں بل کی صورت

○

بگڑی ہوئی اوقات بنائے نہ بنے ہے
چاہوں ہوں وہ آئے پہ بلائے نہ بنے ہے

ہر غم کو اٹھانے کی سکت ہے مرے دل میں
اک ہجر کا صدمہ کہ اٹھائے نہ بنے ہے

سب بھید زمانے کے مرے دل میں چھپے ہیں
اک تیری محبّت کہ چھپائے نہ بنے ہے

نمرود بھی لگوائے تو ہو جائے ہے ٹھنڈی
اک دل کی لگی ہے کہ بجھائے نہ بنے ہے

تیور ہی بگڑنے میں کچھ ایسے ہوئے اُس کے
تصویر مُصوّر سے بنائے نہ بنے ہے

کیا تجھ کو بتاؤں تجھے کس حال میں پایا
اک خواب وہ دیکھا کہ سنائے نہ بنے ہے

الزام ہی ایسا ہے جو تم ہم پہ رکھو ہو
دھرتے نہ بنے ہے جو اٹھائے نہ بنے ہے

وہ چاند سی صورت جو تری جان ہے باقرؔ
کیا دور کی کوڑی ہے کہ لائے نہ بنے ہے

○

منصف کے فیصلے بھی جہاں دل سے آئے ہیں
دنیائے اعتبار میں مشکل سے آئے ہیں

اصرار ہو رہا ہے کہ حق کو نہ حق کہو
اچھے مطالبے صفِ باطل سے آئے ہیں

آسودگیٔ زیست سے تنگ آگئے تھے ہم
طوفاں میں جان بوجھ کے ساحل سے آئے ہیں

کیوں ڈھونڈھتے ہیں آپ تعلق دماغ سے
جذباتِ حسن و عشق تو سب دل سے آئے ہیں

رسم و رواج سب کے الگ ہیں مزاج الگ
سب لوگ اپنے اپنے قبائل سے آئے ہیں

ادھیلہ جواب اُن کے ارادوں پہ شک مگر
آ ہی گئے ہیں وہ تو کھلے دل سے آئے ہیں

اسلاف کے لہو کی ہے خوشبو رچی ہوئی
ایسے اثر بھی طینتِ فاضل سے آئے ہیں

یوں ہی تو لاسات میں ہو گئے مگر
ویسے ہیں رو بے مشاغل سے آئے ہیں

○

اگر یہ ذہنِ رسَا اور کچھ رسائی دے
جو لوگ سن نہیں سکتے مجھے دکھائی دے

بھلائی کر نہیں سکتا کوئی بُرائی دے
کسی طرح تو ہمیں دادِ آشنائی دے

ترے مکاں سے کئی بار سوچتے گذرے
کسی طرح تری آواز ہی سُنائی دے

نجانے کب سے یہ محرومیاں مقدر ہیں
کبھی تو میرے خدا اجرِ نارسائی دے

کمالِ ذات ابھرتا ہے۔ جیسے وقتِ زوال
یہ ڈوبتا ہوا سُورج بڑا دکھائی دے

فراق کے ہیں یہ لمحے تو یادگار بنا
بصد خلوص کوئی تحفۂ جُدائی دے

ضمیرِ زُہد بھی آلودۂ ریا ہو جہاں
خدا ہمیں نہ کبھی ایسی پارسائی دے

○

زخمِ دل جب ہرا سا لگتا ہے
وہ ستمگر بھلا سا لگتا ہے

کل کہیں جانِ جاں نہ بن جائے
اجنبی آشنا سا لگتا ہے

کیا کریں اس کی بے رخی کا گلہ
شہر بھر بے وفا سا لگتا ہے

اُس کے لہجے کا زہر تو دیکھو
آدمی دل جلا سا لگتا ہے

وہ رگِ جاں سے بھی قریب سہی
پاس رہ کر جُدا سا لگتا ہے

ہم سے ناخوش نہ ہو خدا کے لیے
سارا عالم خفا سا لگتا ہے

آپ کیوں بدگماں ہیں باقرؔ سے
آدمی تو بھلا سا لگتا ہے

○

جس کی خصلت میں ہو دولت کا پجاری ہونا
اُس تونگر سے تو بہتر ہے بھکاری ہونا

تم شکاری ہو تو شیروں کے شکاری ہونا
ورنہ بہتر ہے اہنسا کے پجاری ہونا

ٹھوکریں کھاؤ نہ تم اہل زمانہ سے کہیں
ہو اگر راہ کے پتھر بھی تو بھاری ہونا

صرف اپنے ہی پہ لوگوں کو نہ چھلنے دینا
اپنے دشمن کے بھی اعصاب پہ طاری ہونا

ہو نمایاں جو کبھی منزلِ افلاک پہ تم
ایک ہی بار نہ ہونا ۔ کئی باری ہونا

پانی پیاسوں کو تو دریا ہی دیا کرتا ہے
ہر سمندر کے مقدر میں ہے کھاری ہونا

ایسی تہذیب سے کیا ربط ہو اپنا کہ جہاں
اک بڑا عیب ہو لڑکی کا کنواری ہونا

○

دُکھ سے دامن کیوں بھرتے ہو رہنے دو
عشق کسی سے کیوں کرتے ہو رہنے دو

ہم تو سراپا پیار ہیں کچھ دشمن تو نہیں
ہم سے ملتے کیوں ڈرتے ہو رہنے دو

جانے دو تم وعدہ کر کے بھول گئے
جھوٹے بہانے کیوں کرتے ہو رہنے دو

اپنے کیئے پر نادم ہو شرمندہ ہو
نام اوروں کو کیوں دھرتے ہو رہنے دو

نزہت پر یہ پھول مرے پر سنو ذرے
اب یہ احساں کیوں کرتے ہو رہنے دو

○

جو سر کشیدہ سرِ منصبِ اَنا ٹھہرے
وہی مقامِ محبت سے آشنا ٹھہرے

کبھی تو شہر مرا قاتلوں سے خالی ہو
کہیں تو سلسلۂ قتل بَرملا ٹھہرے

یہ نفرتوں کے بگولے بجھا نہ دیں اک دن
ان آندھیوں میں کہاں تک کوئی دیا ٹھہرے

وہ جرم جس نے اُسے اِک مقام بخشا ہے
جو کوئی اور کرے لائقِ سزا ٹھہرے

یہ بستیوں کی تباہی یہ قتلِ عام کا رنگ
کہیں تو حضرتِ انساں کا ارتقا ٹھہرے

کہیں تو حق کے لیے ہو لہو کی ارزانی
کوئی تو دشت ہو ایسا کہ کربلا ٹھہرے

بہت دنوں سے زمانہ اس انتظار میں ہے
وہ حرف کون کہے گا جو اک ندا ٹھہرے

○

دونوں سے شکایت ہے مسیحا سے خُدا سے
بنتا ہے کوئی کام دوا سے نہ دُعا سے

ہے نازِ مسیحائی تو پھر چارہ گری کر
مایوس ہیں کُچھ لوگ ترے دستِ شفا سے

جو زینتِ افلاک ہے اس قوسِ قزح نے
سب رنگ چُرائے ہیں ترے دستِ حنا سے

ایسا بھی کبھی ہو۔ کہیں ایسا نہ کبھی ہو
باز آئے ہم اس کشمکشِ بیم و رجا سے

قانونِ مکافاتِ عمل حق ہے سو باقرؔ
ظالم کوئی بچتا نہیں دنیا میں سزا سے

○

حال اسے لکھنے بیٹھا ہوں سوچتا ہوں کیا حال لکھوں
جگ بیتی بھی لکھوں یا بس اپنا ہی احوال لکھوں

اس جگ میں تو یارو سب کی کرنی بھرنی ایک نہیں
کس کس کے احوال بتاؤں کس کس کے افعال لکھوں

مہنگا سستا دونوں رو ہیں فرق کمی بیشی کا ہے
گاہک جیسے پیسے دے ویسی ہی اُس کی فال لکھوں

تن کے اُجلے مَن کے میلے پنڈت مُلّا پوپ گرو
مندر مسجد اور کلیسا جگ ہے سارا جال لکھوں

رُشی مُنی اوتار پیمبر قائد مصلح دانشور
سب کی باتیں من بھاتی ہیں کس کس کے اقوال لکھوں

ناصر۔ ساحر۔ ابنِ انشا۔ فیض و فراق و جوش و جگر
کیسے 'کوی' اور کیسی 'کویتا'۔ اب جو پڑا ہے کال لکھوں

باقر صاحب انشا جی کا رنگِ غزل کچھ میر سا ہے
پھر میں کیسے غالب لکھوں داغ لکھوں اقبال لکھوں

حُسن والے جہاں نہیں ہوتے
ہم بھی اکثر وہاں نہیں ہوتے

دل میں رہتے ہیں مہ جبینوں کے
عاشقوں کے مکاں نہیں ہوتے

قربتیں جب دلوں میں ہوتی ہیں
فاصلے درمیاں نہیں ہوتے

پھول گلچیں بھی توڑ لیتا ہے
سب ہی نذرِ خزاں نہیں ہوتے

اُس جگہ بجلیاں نہیں گرتیں
جس جگہ آشیاں نہیں ہوتے

حُسن مرضی کا اپنی مالک ہے
دیر لگتی ہے "ہاں" "نہیں" ہوتے

ہم جو ہوتے وطن میں تو شاید
اس طرح رائیگاں نہیں ہوتے

○

وہ نگاہوں میں بسا دل کے مکاں تک آیا
جو نہ آتا تھا وہ دیکھو تو کہاں تک آیا

قابلِ رشک ہے مہمان نوازی دل کی
پھر گیا ہی نہیں جو قریۂ جاں تک آیا

ایک سا وقت کسی پر کبھی رہتا ہی نہیں
جو بہاروں میں رہا عہدِ خزاں تک آیا

جان دینے کا سلیقہ کوئی ہم سے سیکھے
حرفِ تحسین زمانے کی زباں تک آیا

○

خبر جو رکھتے ہیں آگے کی عہدِ حال سے قبل
وصیتیں وہی لکھتے ہیں انتقال سے قبل

بتا رہا تھا کہ طوفان آنے والا ہے
سکوتِ شہر پہ طاری تھا جو قتال سے قبل

سبب ضرور تھے قوموں کی داستانوں کے
کسی عروج سے پہلے کسی زوال سے قبل

چھتیں مکانوں کی ان بارشوں میں ٹپکیں گی
یہ دیکھ بھال تو کرنی تھی برشگال سے قبل

یہ عہدِ دیدہ وراں ہے ہُنر کی بات کرد
جوازِ بے ہُنری تھا مگر کمال سے قبل

اذیّتوں کی خلش کا شِش دیکھتا کوئی
وہ کر بنا کئی اظہار عرضِ حال سے قبل

ہجوم درد میں ایک ایک پل کے ساتھی تھے
ترے فراق کے لمحے ترے وصال سے قبل

اٹھو اٹھو کہ بُرا وقت آنے والا ہے
نکل چلو کسی مفتی کی قیل وقال سے قبل

خیال و خواب کی دنیا بسائے بیٹھا ہوں
کوئی خیال نہیں تھا ترے خیال سے قبل

○

وصف یہ عشقِ بوتراب میں ہے
زندگی مستقل ثواب میں ہے

کیا قیامت ترے شباب میں ہے
جیسے ڈوبا ہوا شراب میں ہے

رُخ پہ رنگ حیا کا ہے پردہ
بے حجابی بھی اک حجاب میں ہے

ہجر رکھتا ہے مضطرب دل کو
عافیت اس سے اجتناب میں ہے

وہ زمانے کی گردشوں میں کہاں
جو مزہ اس کے پیچ وتاب میں ہے

کیا کہیں اُس گناہ کی لذت
جو ابھی سعیٔ ارتکاب میں ہے

زاہد و خلد میں کہاں ممکن
وہ جو اِس عالمِ خراب میں ہے

جو تموّج مزاجِ یار میں تھا
وہی دستورِ انقلاب میں ہے

○

نہ خضر کی نہ کسی راہبر کی بات کرو
سفر کی بات کرو ہمسفر کی بات کرو

عروجِ علم و زوالِ بشر کی بات کرو
تو بد مذاقیٔ اہلِ نظر کی بات کرو

ہیں سب اسیر عقیدت کے قید خانوں میں
جبیں کی بات کرو سنگِ در کی بات کرو

جو رہگذر ہی سے منزل نصیب ہوتی ہے
تو منزلوں کی نہیں رہگذر کی بات کرو

تم آج ہم سے ہماری وفا کے طالب ہو
تو ایک دن کی نہیں عمر بھر کی بات کرو

پہاڑ رات بھی آخر گذر ہی جائے گی
اِدھر کی بات کرو کچھ اُدھر کی بات کرو

جو دیکھنی ہو تمھیں مفلسی زمانے کی
متاعِ مہر و مذاقِ نظر کی بات کرو

یہ مصلحت ہے خبر اور واقعہ کچھ اور
تو واقعہ کی نہیں بس خبر کی بات کرو

○

خون بہتا ہوا جلتے ہوئے گھر دیکھے ہیں
ہم نے ہر عہد میں شاہوں کے ہُنر دیکھے ہیں

ہر زمانے میں رہے بیعتِ جابر کا جواب
کوفہ و شام نے نیزوں پہ وہ سر دیکھے ہیں

دورِ تاریخِ ستم اپنے لہو سے لکھ کر
خاک میں ملتے ہوئے شمس و قمر دیکھے ہیں

ہم نے دیکھے ہیں فصیلوں پہ لہو کے دھبے
ہم نے دیواروں میں چُنتے ہوئے سر دیکھے ہیں

فنِ تعمیر کے شہکار بھی دیکھے ہیں بہت
اور پھر کٹتے ہوئے دستِ ہنر دیکھے ہیں

دشتِ امکانِ وفا تیری شجر کاری ہیں
کن دعاؤں کا اثر ہے کہ ثمر دیکھے ہیں

سرنگوں پرچمِ اجلال و حشم تھا باقر
خواب سچے ہیں کہ شب پچھلے پہر دیکھے ہیں

○

کشاں کشاں لیے پھرتی ہے جستجو مجُھ کو
وبالِ جاں ہے حسینوں کی آرزو مجُھ کو

اُسے خود اپنی زباں پر بھی اختیار نہیں
سکھا رہا ہے جو آدابِ گفتگو مجُھ کو

میں دیکھ لیتا ہوں بینائیوں سے آگے بھی
سنائی دیتی ہے خاموش گفتگو مجُھ کو

خدا ہی جانے عدو مجُھ کو کیا سمجھتا ہے
یہ دوست ہیں جو سمجھنے لگے عدو مجُھ کو

اب اُس کا حال سُننے بھی زمانہ بیت گیا
وہ جس کے قرب کی رہتی تھی جستجو مجھ کو

بتا گئی ہے کہ کیا ہے رفاقتوں کا عذاب
نماز پڑھنی پڑی ہے جو بے وضو مجھ کو

سُنا ہے جب سے کہ مرنا وصال ہوتا ہے
سوائے موت نہیں کوئی آرزو مجھ کو

○

نجانے کیا ہے کہ جن کو بھلانے لگتے ہیں
وہ لوگ اور بھی کچھ یاد آنے لگتے ہیں

وہ اپنے حُسن کی جب داد پانے لگتے ہیں
تمام موئے بدن مُسکرانے لگتے ہیں

کبھی جو سرو کی قامت کا ذکر چھڑتا ہے
تو اپنے قد سے قیامت اٹھانے لگتے ہیں

جو بزمِ ماہ رخاں ہو تو جل کے پوچھیں گے
تمھارے کیا یہ فلانے فلانے لگتے ہیں

میں بے رخی کی شکایت کبھی جو کرتا ہوں
نہیں کیئے ہیں جو احساں جتانے لگتے ہیں

نئے زمانے کے عاشق عجیب ہیں کہ جنھیں
وصال و ہجر کے قصّے پرانے لگتے ہیں

دلوں کی خیر نظر سے نظر جو ملتی ہے
تو ٹھیک ٹھیک جگہ پر نشانے لگتے ہیں

○

کیا بتائیں کہ محبت میں کہاں تک پہنچے
اپنے قصّے بھی زمانہ کی زبان تک پہنچے

پوچھتے کیا ہو کہ انسان کہاں تک پہنچے
جہاں عاجز ہیں فرشتے بھی وہاں تک پہنچے

اپنی مٹی بھی گئی اپنا تشخّص بھی گیا
کوئی تو ہو جو اِس احساسِ زیاں تک پہنچے

آج یوسف کے خریدار ہیں پھر مصر کے لوگ
دیکھئے گرمئ بازار کہاں تک پہنچے

میں تو مقتل میں بہت دیر سے اِستادہ ہوں
دیکھنا یہ ہے کہ احباب کہاں تک پہنچے

اور کچھ نام رکھو اُس کو محبت نہ کہو
وہ تعلق جو حدِ سود و زیاں تک پہنچے

کتنے اقراروں سے اچھی ہے تمھیں کیا معلوم
وہ نہیں جو لبِ اِنکار سے ہاں تک پہنچے

لائقِ فہم نہیں تلخ زبانی اُس کی
قندِ شیریں دہناں جس کی زباں تک پہنچے

اپنے اشعار سے دیتا ہوں محبت کا پیام
دیکھتا ہوں مری آواز کہاں تک پہنچے

○

یہی اُمید بہت ہے اک اجنبی کے لیے
کوئی تو ہاتھ بڑھائے گا دوستی کے لیے

محبتوں میں تنوّع ہے زندگی کے لیے
کبھی کسی کے لیے ہے کبھی کسی کے لیے

خدا گواہ کہ اہلِ غرض کی دُنیا میں
ترس گیا ہوں محبت کی زندگی کے لیے

اسیرِ ذات نہ ہو دوسروں کے دُکھ بانٹو
جیو کسی کے لیے اور مرو کسی کے لیے

طویل سلسلۂ غم کے بعد آتی ہے
کچھ اہتمام ضروری تو ہے خوشی کے لیے

ابوتراب سے نسبت پہ میری حیرت کیوں
مرے وجود کی مٹی بنی علیؑ کے لیے

جلا ہے دل تو اندھیرا تو چھٹ ہی جائے گا
چراغ ہی تو جلاتے ہیں روشنی کے لیے

○

عشق ایسی اُڑان سے نکلا
تیر جیسے کمان سے نکلا

بن بلائے کوئی نہیں آتا
کام کچھ تو اذان سے نکلا

عشق کچھ کارِ کم نسب تو نہ تھا
قیس بھی خاندان سے نکلا

جب زوال آفتاب کا دیکھا
سایہ بھی سائبان سے نکلا

جانے کتنی سماعتوں بس گیا
جو بھی کلمہ زبان سے نکلا

دل جلائے گئے زمینوں پر
اور دھواں آسمان سے نکلا

وہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
تیر جو بھی کمان سے نکلا

کسی مظلوم نے جو آہ بھری
شعلہ سا آسمان سے نکلا

○

رات کی مستی کی تھوڑی منظر آرائی بہت
ٹوٹنے کو وقت صبح ایک انگڑائی بہت

حوصلہ جب تھا تو یہ گہرے سمندر کچھ نہ تھے
اور اب پایاب دریا کی بھی گہرائی بہت

راستے کا ربط منزل سے بھی ہونا چاہیے
یوں تو مجنوں نے بھی کی ہے دشت پیمائی بہت

یہ تو سچ ہے سب بنی آدم ہیں اور سب بھائی ہیں
آج کل بر ہم مگر بھائی سے ہے بھائی بہت

ایک بھی تم سا نہیں ہے جس کو اپنا کہہ سکیں
اور یوں دیکھو تو دنیا سے شناسائی بہت

یہ تو بازارِ تجارت ہے یہ دُنیا اور ہے
شہرِ اہلِ دِل میں ہے اپنی پذیرائی بہت

شکوۂ ناقدریٔ اہلِ نظر ہم کیا کریں
یہ وہ دُنیا ہے جہاں پربت ہے کم رائی بہت

○

اب آگے کیا کہوں اتنا بہت ہے
جو دریا ہے وہ خود پیاسا بہت ہے

وہی اس شہر میں اچھا بہت ہے
جو سُنتا کم ہے اور کہتا بہت ہے

اٹھا سکتا نہیں میں بارِ احساں
یہ تھوڑا بھی مجھے لگتا بہت ہے

خرد کو چاہیے صحرا نوردی
جنوں شرمندۂ صحرا بہت ہے

ہمارا دل ہے آئینہ کی صورت
جو چپ رہتا ہے اور کہتا بہت ہے

یہی ہوتا ہے نسلوں کا توارد
کہ بیٹا باپ سے ملتا بہت ہے

اگر ہے کچھ تو اک خوئے وفا ہے
وہی اس شہر میں عنقا بہت ہے

درِ دل پر صدا دے کر تو دیکھو
سخی کا ایک دروازہ بہت ہے

ہو ذوقِ بندگی مخلص تو باقرؔ
کسی کا ایک نقشِ پا بہت ہے

○

نہ ابر و باد نہ جامِ شراب مانگتے ہیں
ہمارا خون بہا ہے حساب مانگتے ہیں

نہ سیم و زر نہ مہ و آفتاب مانگتے ہیں
ذرا سی خاکِ درِ بوتراب مانگتے ہیں

عجیب رند ہیں یہ یا تو مانگتے ہی نہیں
جو مانگتے ہیں تو پھر بے حساب مانگتے ہیں

جو جانتے ہی نہیں انقلاب کیا شے ہے
وہ روز ایک نیا انقلاب مانگتے ہیں

محبتوں کے ہیں سارے مسوّدے دل میں
جو خط لکھے نہیں ان کے جواب مانگتے ہیں

ہماری بات نہ پوچھو عجیب لوگ ہیں ہم
کہ شاخِ خُشک پہ تازہ گلاب مانگتے ہیں

کہیں تو حُسن سے ظاہر کوئی تعلق ہو
سو ہم بھی اِک نظرِ اِنتساب مانگتے ہیں

○

جس کو خود اپنی معرفتِ ذات ہو گئی
گویا خدا سے اُس کی ملاقات ہو گئی

وہ کہہ کے اٹھ گئے کہ بہت رات ہو گئی
بازی ابھی بچھی بھی نہ تھی مات ہو گئی

اُس خوش بدن کے بام پہ آنے کی دیر تھی
پھر تو تجلّیات کی برسات ہو گئی

سب دھوپ چھاؤں وقت کی گردش کے ساتھ ہیں
چھوٹے ہوئے جو دن تو بڑی رات ہو گئی

پورا کوئی بھی آپ کا وعدہ نہیں ہوا
ہر بار بس کوئی نہ کوئی بات ہو گئی

اب کر رہے ہیں اپنی خطاؤں پہ غور ہم
جب ختم راہ و رسمِ ملاقات ہو گئی

میرا ہی دُکھ تو سارے قبیلے کا دُکھ ہوا
میری دُعا سبھی کی مناجات ہو گئی

بیگانہ ہو کے عقل سے مذہب کی پیروی
پابندیٔ رسوم و روایات ہو گئی

باقرؔ کو اس غزل پہ جو دادِ سخن ملی
خوش ہو گئے کہ عزّتِ سادات ہو گئی

○

سروں کے ساتھ ہوئے تذکرے سنانوں کے
تو یاد رہ گئے قاتل گئے زمانوں کے

وہ ناخدا تھا جو یہ بات جانتا ہی نہ تھا
کہ رُخ ہوا ہی بدلتی ہے بادبانوں کے

وفائے عہد میں حائل نہیں حنا بندی
بدل گئے ہیں اب انداز بھی بہانوں کے

خوشی سے وہ در و دیوار جھومتے ہوں گے
مکین لوٹ کے آتے ہیں جن مکانوں کے

جلے تھے گھر تو بہت پر یہ پہلی بار ہوا
کہ تذکرے ہوئے جلتے ہوئے مکانوں کے

عجب نہیں ہے جو گھر سے کوئی نہیں نکلا
سبب ہی اور تھے بے وقت کی اذانوں کے

کہیں بھی حُسن حجابوں میں اب نہیں رہتا
بدل رہے ہیں قرینے نگار خانوں کے

لہو بہے بنا نسلوں کا خون ہو جائے
نئی طرح کے ہیں قاتل نئے زمانوں کے

○

مُنقلب نظمِ دو جہاں نہ کرو
شہر کے شہر بے اماں نہ کرو

اور تو ہیں رہرواں نہ کرو
منّتِ میرِ کارواں نہ کرو

مہ جبینوں سے میل جول رکھو
ترک رسم و رہِ بتاں نہ کرو

موسمِ گُل کا لطف بھی تو اٹھاؤ
خوفِ تاراجیٔ خزاں نہ کرو

اپنے گھر کے دیئے رکھو روشن
فکرِ قندیلِ آسماں نہ کرو

سلسلہ ہی نہ ختم ہو جائے
دوریاں اتنی درمیاں نہ کرو

چاندنی پھیکی لگنے لگتی ہے
ذکرِ آئینہ بیکراں نہ کرو

کیسے رنگیں خیال آتے ہیں
ایسی معصوم شوخیاں نہ کرو

دشمنوں کے حصار میں بھی جیو
خواہشِ یارِ مہرباں نہ کرو

آنکھ سے دل کے پار اترنے دو
یہ نظر تیر ہے کماں نہ کرو

بڈّھے طوطے پڑھا نہیں کرتے
فکرِ تعلیمِ بالغاں نہ کرو

شعلے احساس کے بھڑکنے دو
مشتعل آگ کو دھواں نہ کرو

○

نہ سلسلہ ہے کوئی اور نہ رابطہ ہے کوئی
دیارِ غیر میں ایسے بچھڑ گیا ہے کوئی

نظر میں ہے کوئی منزل نہ راستہ ہے کوئی
ہماری طرح کہاں اور جی رہا ہے کوئی

یہ کارِ خضرؑ ہماری روش سے ملتا ہے
اُٹھا لیا اُسے بڑھ کر اگر گرا ہے کوئی

کسی سماج میں سب ایک سے نہیں ہوتے
کہ ایک گھر میں بھی چھوٹا کوئی بڑا ہے کوئی

برابری کے یہ دعوے مُسابقت کی یہ دوڑ
جو قد نہیں ہے تو سائے کو ناپتا ہے کوئی

نہ جانے کب سے یہ خوش فہمیاں سہارا ہیں
نگاہِ شوق سے ہم کو بھی دیکھتا ہے کوئی

چلو چلو کہ کسی کے تو کام آجائیں
سنو سنو کہ صدا ہم کو دے رہا ہے کوئی

پھُولوں کے انگ میں نہ کلی کے بدن میں تھی
خوشبو تو اُس کے اُترے ہوئے پیرہن میں تھی

جتنے خدا تھے اتنی عقیدت گذاریاں
کتنے بتوں کی چاہ دلِ برہمن میں تھی

ایک پیکرِ جلال تھا سویا ہُوا شباب
فتنے نہیں تھے صُبحِ قیامت بدن میں تھی

دل چیز کیا ہے خرمنِ ہستی کو پھُونکتی
دبکی ہوئی وہ آگ مرے حُسنِ ظن میں تھی

پاسِ مزاجِ حُسن سے چپ ہو کے رہ گئے
تھے لفظ بھی زباں پہ زباں بھی دہن میں تھی

اِس دشتِ رنگ و نور میں بھولی نہیں ابھی
سادہ سی زندگی جو دیارِ وطن میں تھی

ناراستیٔ اہلِ ادب کا گلہ نہ کر
شائستگی کی خو بھی کبھی اہلِ فن میں تھی

اس شہرِ بے بصر کے شب و روز پر نہ جا
اپنی بھی قدر حلقۂ اہلِ سخن میں تھی

اہلِ غزل کو مل نہ سکا میرؔ کا مقام
وہ بات اور ہے جو خدائے سخن میں تھی

وہ ایک وسیع و عریض حویلی کے اونچے اونچے محرابی دروازوں سے نکلا' ایسے دروازے جن سے کبھی اس کے پرکھوں کے زمانے میں 'لوگ ہاتھی سے اُترے بنا گزر جایا کرتے تھے۔ یہ منظر اس نے خود تو نہیں دیکھا لیکن ان چہروں سے سنا ضرور تھا کہ جنکی آنکھوں نے راجوں مہاراجوں کا دور دیکھا تھا۔ اس نے تو اپنی آنکھوں سے بس گوری رنگت والوں ہی کو راج کرتے دیکھا تھا۔ پھر ایک آندھی ایسی چلی جس نے وسیع و عریض مگر گرتی ہوئی حویلی کے مکینوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کچھ بچھڑنے اور بٹنے کے تاریخی عمل نے اسکے پاؤں میں ہجرت کی پہلی زنجیر ڈال دی۔ اس سے اس کی آنکھوں میں ریت کے ذرّے چبھ تو رہے تھے لیکن نگاہوں میں کچھ خواب بھی سجے ہوئے تھے۔ وہ انہیں خوبصورت خوابوں کی تعبیر میں اپنے روز و شب کی تسبیح کے دانے گنتا رہا۔

تسبیح کے دانے شمار کرنیوالے اس شخص باقر زیدی کے سر پر ابھی باپ کا سایہ تھا اور پھر جو یہ دیوار گری تو اس نے اپنے پرکھوں کی میراث کا تمام بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ اس پوٹلی میں شعر و ادب کا بھی ایک ورثہ تھا اور اسی ورثے کی حفاظت پر آج بھی باقر زیدی صاحب مامور ہیں۔ دوسری خود اختیاری ہجرت بھی ان کو اس فرض سے غافل نہ کر سکی اور "لذّتِ گفتار" اسی فرض اور خاندانی قرض کی کہانی ہے۔

یہ کہانی ایسی ذاتی بھی نہیں کہ اسے صرف انکی ذات کے حصار میں قید سمجھ لیا جائے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس میں ہمارے معاشرے کے تقریباً سبھی کردار جیتے جاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان جیتے جاگتے کرداروں سے گفتگو کیلئے سلیقۂ گفتگو بنیادی شرط ہے کہ اسکے بغیر لذّتِ گفتار کی دولت کسی کے بھی ہاتھ نہ آسکے گی۔

(باقر زیدی کے مجموعۂ کلام "لذّتِ گفتار"
پر لکھے گئے ایک مضمون سے اقتباس)

اشفاق حسین
(کینیڈا)

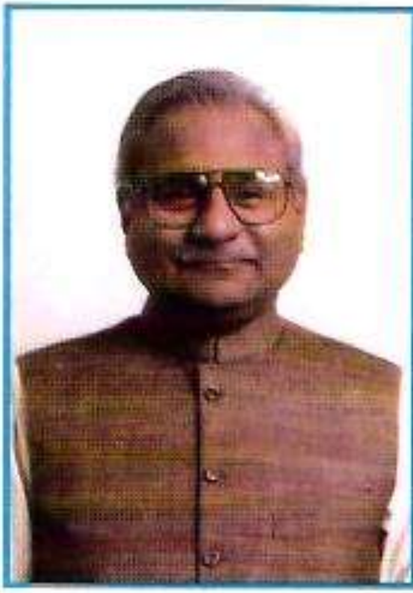

دل پہ کرتے ہیں دماغوں پہ اثر کرتے ہیں
ہم عجب لوگ ہیں ذہنوں میں سفر کرتے ہیں

آلِ شفق پرنٹرز

ایل۔ ایس۔ ٦ بلاک ١٧، فیڈرل بی ایریا کراچی، فون:- ٦٣٤٩٤٦٤